ہفت روزہ

شمارہ جون ۱۹۹۱ء

ندائے خلافت

لاہور

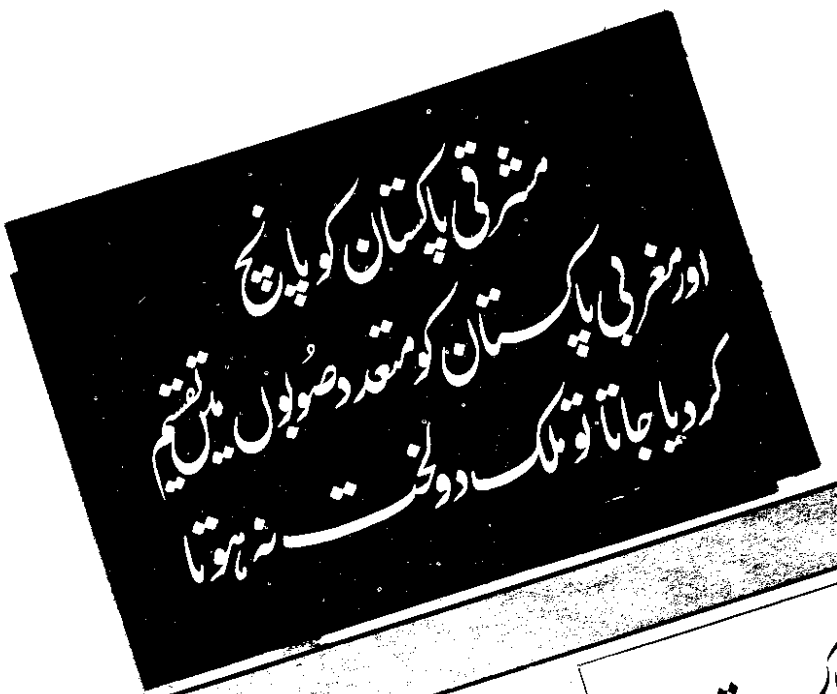

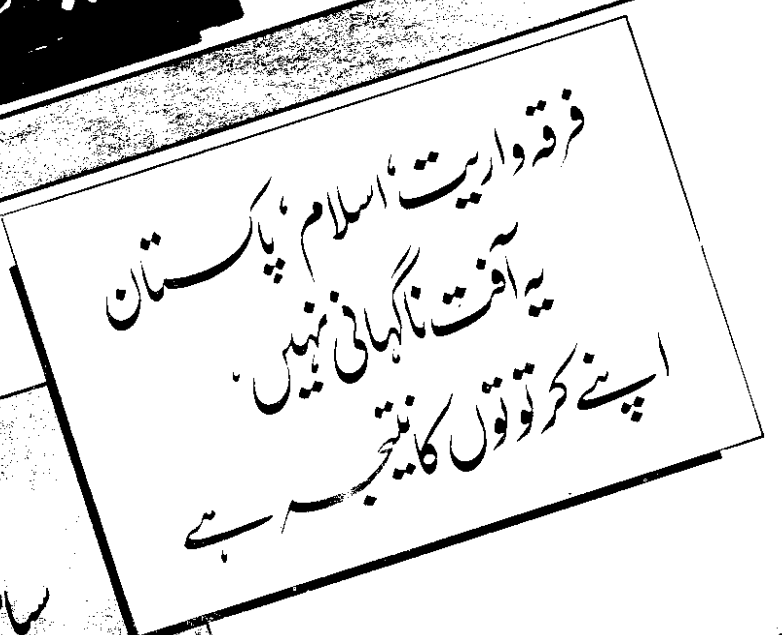

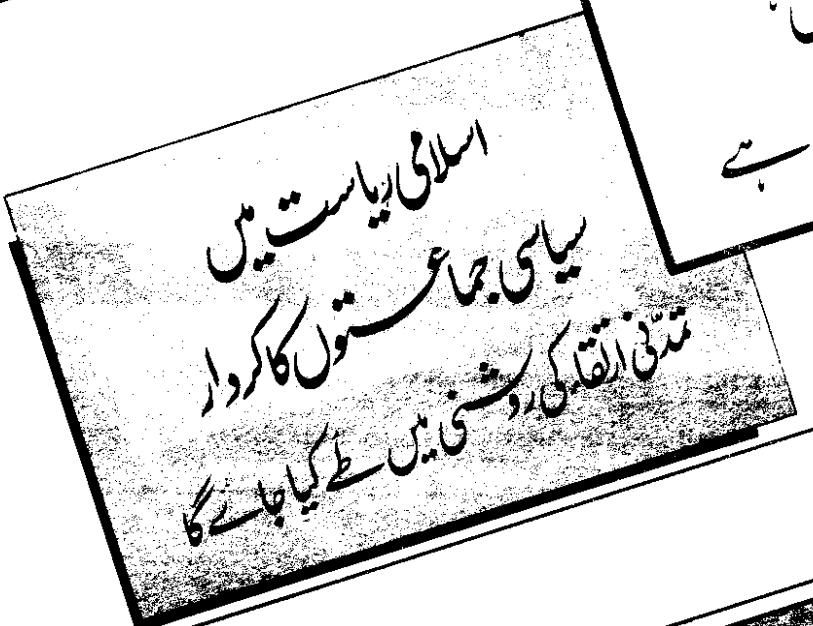

ناظم تحریک خلافت پاکستان نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا

اس استحصالی نظام کو بدلنا ہے تو آگے بڑھئے

ڈیرہ اسماعیل خاں' بنوں اور پشاور میں کنوینگ کمیٹیوں کی تشکیل

اشفاق میر

داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ سرحد میں (۱۶ تا ۲۰ دسمبر ۹۱ء) ڈیرہ اسماعیل خان سے پشاور تک کے جلسہ ہائے عام میں دعوت فکر و عمل کے جس کام کا آغاز ہوا' اس میں مزید پیش رفت کے لئے ناظم تحریک خلافت پاکستان جناب عبدالرزاق صاحب نے لاہور سے ڈیرہ اسماعیل خان اور راقم نے پشاور سے ڈیرہ کے سفر کا آغاز موخہ ۲۳ر مئی کو صبح نماز فجر کے بعد کیا۔ اس سے پہلے اس دورہ کی تاریخ ۲۱ر مئی تھی مگر ڈیرہ کے کنوینر کی درخواست پر اسے بادل نخواستہ تبدیل کرنا پڑا جس کے چند ناخوشگوار اثرات بھی مرتب ہوئے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے باوجود سخت گرمی کے ڈیرہ میں بعد از نماز عشاء جی پی او کی مسجد میں معاونین کے اجتماع کا انتظام کیا گیا۔

معاونین اور دیگر حضرات سے تعارف کے بعد اس نشست کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ راقم کے تمہیدی کلمات کے بعد جناب عبدالرزاق نے قرآن و سنت کے حوالے سے نظام خلافت کے موضوع پر مدلل خطاب کیا اور حاضرین میں سے معاونین کے علاوہ دیگر حضرات سے بھی اس فکر اور کام کو آگے بڑھانے کے لئے پر زور اپیل کی۔ اس کے نتیجہ میں مزید ۴/۵ حضرات تحریک خلافت میں شامل ہوئے۔ حاضرین میں ایک ریٹائرڈ کرنل اللہ نواز بھی تھے۔ یہ صاحب باقاعدہ طور پر مدعو نہ تھے بلکہ معاونین کے اجتماع کے اعلان پر از خود تشریف لائے۔ ان کے کچھ اشکالات تھے۔ وقت کی کمی کے باعث ان کو اگلے روز صبح ۹ بجے کا وقت دیا گیا۔ اگلے روز ان سے مکمل کے بات چیت ہوئی جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور یہاں تک کہا کہ مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے۔ مگر میرا شامل ہونا باعث تقویت کی بجائے کہیں باعث نقصان ثابت نہ ہو اس لئے کہ میں اپنے آپ کو آپ لوگوں کے معیار کے مطابق نہیں پاتا۔ بہر حال تفصیلی گفتگو کے بعد وہ معاون تحریک بننے پر آمادہ ہوگئے۔ اور پھر ایسے گھل مل گئے کہ ہمیں اپنے ایک دوست شریف ورک صاحب کے پاس لے گئے جو ڈیرہ میں ڈی آئی جی ہیں۔ شریف ورک صاحب جناب ڈاکٹر صاحب کے پرانے شناسا نکلے۔ انہوں نے بتایا کہ حال ہی میں وہ لاہور سے ڈاکٹر صاحب کے دو لیکچر سن کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ انکی اہلیہ جو ماڈل ٹاؤن میں ہی رہائش پذیر ہیں محترم ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن کی بے حد مداح ہیں اور ان کے کیسٹ اور کتابیں ڈیرہ میں خواتین میں مطالعے کے لئے تقسیم کرتی ہیں' کرنل صاحب نے بتایا کہ ان کے گھر میں بھی انہی کے توسط سے یہ پیغام پہنچا ہے۔

ان حضرات کے علاوہ ڈگری کالج کی مسجد کے خطیب مولانا محمد اختر صاحب بھی اتنے متاثر نظر آئے کہ انہوں نے بھی اگلے روز کالج کی مسجد میں طلباء سے خطاب کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ۲۴ر مئی بعد نماز مغرب عبدالرزاق صاحب نے ڈگری کالج کی جامع مسجد میں نظام خلافت کی برکات پر مفصل خطاب کیا اور آخر میں چار ورقہ تقسیم کیا اور پھر طلبا میں معاونین کے فارم بھی تقسیم کئے گئے خطیب صاحب نے ٹھنڈے مشروب سے تواضع فرمائی۔ یہاں طلباء کی حاضری تقریباً ۳۰ کے لگ بھگ تھی۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں بعد نماز عشاء اندرون شہر کی ایک جامع مسجد میں درس قرآن کی ایک نشست بھی ہوئی جس میں سورۃ التوبہ کی آیات ۱۱۱-۱۱۲ کے حوالے سے نظام خلافت کے قیام کی جدوجہد کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ یہاں شرکاء کی تعداد ۲۵ کے قریب تھی۔ ڈیرہ میں تحریک کے کام کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں درج ذیل حضرات پر مشتمل کنوینگ کمیٹی تشکیل دی گئی:

۱) محمد صادق بھٹی صاحب کنوینر
۲) حافظ محمد فرید صاحب سیکریٹری
۳) کرنل ریٹائرڈ اللہ نواز صاحب ممبر
۴) شاہ جہان صاحب ممبر
۵) محمود الحسن صاحب ممبر

اگلی صبح یعنی ۲۵ر مئی کو بنوں کے لئے روانگی ہوئی۔ بنوں میں سعید حمید الدین صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ انہوں نے سرکٹ ہاؤس میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ یہاں رحمت اللہ خٹک اور اختر سلیم کین صاحبان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ دونوں حضرات بنوں کی معروف تاجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی تردد کے تحریک میں شامل ہونا پسند فرمایا۔ پروگرام کے مطابق میلاد پارک کے قریب والی مسجد میں بعد از نماز عشاء معاونین کے اجتماع کا انتظام تھا۔ ساڑھے چھ بجے حسب معمول تعارف کے بعد تلاوت قرآن مجید سے آغاز ہوا۔ چند تمہیدی کلمات کے بعد ناظم تحریک خلافت نے قرآن و سنت کے حوالے سے بھرپور انداز میں تحریک خلافت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ اس استحصالی نظام کو واقعی بدلنا چاہتے ہیں' تو آگے

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۲۱
۱۵ر جون ۱۹۹۳ء

مدیر
اقتدار احمد
معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
مرکزی دفتر: ۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
مقامِ اشاعت
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد، طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ -/۳ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرونِ پاکستان) -/۱۲۰ روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۶ر امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۲ر " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۷ر " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰ر " "

لبیک، اللھم لبیک ...

ذرا چشمِ تصور وا کر کے دیکھئے، اللہ کے لاکھوں بندے فوج در فوج اور موج در موج میدان عرفات کی طرف لپک رہے ہیں ان میں کالے بھی ہیں گورے بھی، سرخ و سفید بھی ہیں زرد رو بھی، عظیم الجثہ بھی ہیں پستہ قد بھی۔ چہروں پر راستوں کی دھول ہے، دلوں میں اضطراب کا غبار ہے جو جبلِ رحمت کے جوار میں مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ، سسکیوں اور آنسوؤں سے ہی دھویا جا سکے گا۔ اپنی اپنی سیاسی معاشرتی اور معاشی حیثیتیں سب لوگ ام القریٰ میں میں چھوڑ آئے ہیں اور ان کی علامت بننے والے لبادے جسم پر موجود نہیں، ان کی جگہ وہی بے سلی دو سفید چادریں جنہیں جی خود لپیٹ لی گئی ہیں جن سے بعد مرنے کے پس ماندگان اس بدن کو ملبوس کریں گے۔ کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، نسل کا نہ ذات کا اور نہ اوقات کا، جیسے اس وقت کوئی فرق نہیں رہے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ سینکڑوں بولیاں بولنے والوں کی زبانوں پر یکساں زیر و بم میں ایک ہی ترانہ ہے۔ **لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمت لک والملک، لا شریک لک۔** میدان حشر میں بھی تو یہی کیفیت ہوگی جب ہر کوئی اپنے اعمال کو احتساب کے پلڑے میں ڈالنے کے لئے کشاں کشاں میزانِ عدل کی طرف بڑھ رہا ہوگا۔ اب لوگ ایک بلاوے کے جواب میں اپنی مرضی سے چلے آرہے ہیں، تب خوانی نخواہی گھسیٹے جائیں گے۔ اے اللہ! ان کی وارفتگی کو شرفِ قبولیت عطا فرما اور اہل ایمان کے لئے وہ سخت مرحلہ بھی آسان کردے جس سے مفر نہیں، جو لاریب ایک دن آکر رہے گا۔

اللہ کے حکم سے اس کے ایک برگزیدہ بندے نے امام الناس کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر ایک صدا لگائی تھی جس کے جواب میں دنیا بھر سے مسلمان "حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں" پکارتے ہوئے وادی غیر ذی زرع میں کھنچے چلے آتے ہیں اور یہ رسم ہر سال نبھائی جاتی ہے جو دراصل ایک علامت ہے فرمانبرداری کے اس طرزِ زندگی کی جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا اور درجہ کمال کو پہنچا کر دکھا دیا تھا، فرمانبرداری کی وہی روش اس رسم کی روح ہے جو اللہ اپنے بندوں میں سال کے بارہ مہینے، مہینے کے تیس دن اور دن کے چوبیس گھنٹے جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہے۔ عبادت کی ہر دوسری رسم کی روح بھی یہی روش ہے اور اگر ہمارا تصور فرائض دینی دھند لا نہیں گیا، مسخ نہیں ہوگیا تو ہمیں اس بات کا واضح شعور ہونا چاہیے کہ آج جس پکار پر لبیک کہنا ہم پر بدرجہ اولیٰ واجب ہے وہ دین کی نصرت کا بلاوا ہے اور یہ بلاوا ہر مسلمان کو ہر آن دیا جا رہا ہے، رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر، مقام و مرتبہ کے فرق کے بغیر۔ اللہ کا دین آج غریب الغرباء ہے۔ وہ دین جو غالب ہونے اور غالب رہنے کے لئے آیا تھا، مغلوب ہو کر رہ گیا ہے اور اس سے رشتہ جوڑنے والے بھی روئے زمین پر ہر جگہ مغلوب و مقہور ہیں۔ ان کی عزت دین کی عظمت سے تھی، وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر، اور دین مغلوب ہوا تو انہیں سرافرازی کیسے میسر آسکتی ہے!۔

مبارک ہیں اللہ کے وہ بندے جنہیں دین کے بلاوے پر اس کی تائید و نصرت کی توفیق سے نوازا گیا ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ بھی انہی کے ساتھ ہے کہ میرے دین کی مدد کرو گے تو مجھے اپنا مددگار پاؤ گے اور جسے خود اللہ کی مدد حاصل ہوجائے، اسے اور کیا چاہیے!۔ ○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلامِ الٰہی

سورۃ البقرہ
(آیات ۱۰۴-۱۰۵)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

اے اہل ایمان، مت کہا کرو "راعنا" اور کہو "انظرنا" اور توجہ سے سنا کرو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ○

(کہ یہود کی شرارت نفس اور خبث باطن کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ ان میں سے بعض منافقانہ طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں آتے تو اپنے شوق استفادہ کے اظہار کے لئے اور نبی اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لئے بار بار "راعنا" کا لفظ دہراتے۔ "راعنا" ایک مجلسی کلمہ ہے جو مقرر یا متکلم کو متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ ذرا ہمارا لحاظ کیجئے، ہماری رعایت کیجئے اور اپنی بات دہرا دیجئے تاکہ ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ یہود شرارت کے طور پر حضورؐ کی محفلوں میں اس لفظ کو ذرا دبا کر اور زبان کو لوچ دے کر ادا کرتے اور "راعنا" کا "راعینا" بنا دیتے تھے جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ اور اسطرح اپنے تئیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرکے جی ہی جی میں خوش ہوا کرتے۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس لفظ کے استعمال سے منع فرمایا کہ اس لفظ کا استعمال ہی ترک کردو تاکہ کسی کو شرارت کا موقع نہ ملے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر متوجہ کرنا مقصود ہو تو "انظرنا" کہا کرو جو "راعنا" کا ہم مفہوم لفظ ہے اور اس سے تمہاری مجلسی ضرورت باحسن وجوہ پوری ہو سکتی ہے!)

نہیں چاہتے وہ لوگ کہ جنہوں نے کفر کیا، وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی جانب سے کوئی خیر نازل ہو۔ اور اللہ خاص کرلیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے ○

(کہ یہود اور مشرکین میں سے جو اہل کفر ہیں وہ ہرگز تمہارے بہی خواہ نہیں ہیں۔ ان کی دلی آرزو یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کی رحمت میں سے کوئی حصہ نہ ملے، بالخصوص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم کا نزول ان کے لئے سخت تکلیف کا باعث ہے۔ یہود کی شدید تمنا تھی کہ نبی آخر الزمان کی بعثت ان کی نسل یعنی بنی اسرائیل میں ہوتی اور اللہ کا آخری کلام ان پر اترتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ یہ سارا فضل بنو اسماعیل کے حصے میں آگیا تو ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اللہ کے فضل اور اسکی رحمت پر کسی نسل یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے اور جتنا چاہے اپنے فضل سے نوازے، کوئی اس کے آڑے نہیں آسکتا!)

جوامع الکلم

سمجھ دار وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرتا رہے اور عمل کرے اس زندگی کے لئے جو موت کے بعد ہے،

(کہ حقیقتہً صاحب فہم و شعور تو وہی ہے جو وقتاً فوقتاً اپنا جائزہ لیتا رہے کہ وہ دین کے اعتبار سے کس مقام پر ہے، اپنی دینی ذمہ داریوں کو کس حد تک ادا کررہا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کہیں اس سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی، اور اگر کوتاہی ہو رہی ہو تو اس کی تلافی کی فکر کرے۔ یہ خود احتسابی بہت اہم ہے۔ ۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم　　کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اسی طرح اس کی سمجھ بوجھ اور فراست کا تقاضا یہی ہے کہ وہ دنیا کی اس چار روزہ زندگی کو اصل زندگی سمجھ کر اسی کو اپنی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کا ہدف قرار نہ دے بیٹھے بلکہ اپنے اصل، حقیقی اور دائمی مستقبل یعنی آخرت کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرے کہ اصل زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے!)

(جامع ترمذی بروایت حضرت شداد بن اوسؓ)

یہ آفت ناگہانی نہیں ' اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے

فرقہ واریت ' اسلام ' پاکستان

اس طوفان بلاخیز کا مقابلہ کون کرے گا؟

عبدالکریم عابد

پاکستان کی کشتی میں دو بڑے سوراخ صاف نظر آتے ہیں ۔ ایک سندھ کا شگاف ہے جسے پر کرنے کے لئے فوج طلب کرلی گئی ہے دوسرا قومی وجود میں فرقہ واریت کا ڈالا ہوا چھید ہے ' اور کچھ پتہ نہیں کہ اسے کون بند کرے گا اور یہ بند ہوں گے کیسے !۔ افغانستان میں شیعہ تنظیم وحدت اسلامی اور اس کے مخالفین کے درمیان جھڑپوں کے بعد ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ عناصر کو اور شہ ملے گی ۔ یہ فرقہ وارانہ فساد پہلے بھی ہمارے اندر کچھ کم نہیں تھا ' اب افغانستان کے راستے مزید آرہا ہے اور اس کی خوفناکی کا ابھی سے اندازہ کرلینا چاہیے ۔

تحریک پاکستان "مسلم قوم پرستی" کی پیداوار تھی ۔ اس مسلم قوم پرستی نے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا تھا لیکن یہ جذبہ اتحاد کے لئے کوئی مضبوط اساس ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی لسانی اور فرقہ وارانہ دونوں طرح کی عصبیتوں نے ہمیں جکڑنا شروع کردیا ۔ ان عصبیتوں سے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہم اسلام کے پیغام کو صحیح معنوں میں سمجھتے اور دل و دماغ میں اتارتے لیکن اسلام کو ہم نے صرف ہندو کے ساتھ جنگ کے لئے کار آمد سمجھا اور اسلامی جذبے کا ہمارے پاس صرف یہی مصرف تھا کہ پہلے ہم ہندوؤں سے اور بعد میں بھارت سے اس کی بنیاد پر نبرد آزما رہیں ۔ اس معرکہ آرائی کے دوران کہیں بھی اصل اسلام کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ رسمی ' رواجی اور جذباتی اسلام کو کافی سمجھا گیا لیکن لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کو روکنا اس رسمی ' رواجی اور جذباتی اسلام کے لئے ممکن نہیں تھا ۔

مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آیا تب بھی ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا بلکہ اس عرصہ میں وہ جماعتیں اور تحریکیں بھی اپنی اصل راہ سے ہٹتی چلی گئیں جو اصل اسلام کی سربلندی اور غلبہ کے لئے بنی تھیں ۔ اس انحراف کا فائدہ بھی لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے سوداگروں کو پہنچا۔ یہ سوداگر دو طرح کے تھے ' ایک اسٹیبلشمنٹ میں جنہوں نے انگریز سے حکمرانی کا یہی طریقہ سیکھا تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" وہ اس طریقہ پر عمل کرتے رہے ۔ یہ عمل ضیاء دور میں اپنے عروج پر پہنچ گیا اور اس دور میں اسٹیبلشمنٹ نے لسانی عصبیتوں اور فرقہ وارانہ عصبیتوں دونوں کی خوب خوب سرپرستی کی اور انہیں کھل کھیلنے کے لئے وسیع و عریض میدان فراہم کیا ۔ دوسرے سوداگر وہ لوگ تھے جو عصبیتوں کا سہارا لے کر اپنی قیادت چمکاتے رہے۔ ان کے مقابلے میں نظریہ پاکستان ' اسلامی اخوت اور اتحاد بین المسلمین کا نام لینے والے اس لئے کمزور ہوتے چلے گئے کہ انہوں نے سمجھا تھا کہ صرف نام لینے یا نعرے لگانے سے کام چل جائے گا ۔ معاشرے کے قلب و ذہن کی تعمیر کے لئے پوری نیک نیتی اور یک سوئی کے ساتھ کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ فرقہ واریت کی ہماری تاریخ میں گہری جڑیں ہیں ۔ اس کی فتنہ آرائی کے امکانات سے بے خبر رہنا کسی طرح مناسب نہیں تھا اور اس زہر کا تریاق مسلم معاشرہ کو مہیا کیا جانا چاہیے تھا لیکن یہ کام کون کرتا؟ مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں فرقہ واریت کے خلاف تنفر ضرور موجود تھا ' خاص طور پر مسلم لیگی ذہن کے نزدیک اتحاد بین المسلمین کی قدر و قیمت واضح تھی مگر ایک کو تو مسلم لیگی رہنماؤں نے سمجھا کہ جن مسلمانوں نے پاکستان بنایا ہے وہ اب اتنے جاہل تو نہیں ہوجائیں گے کہ اس تحریک پاکستان کو بھول کر فرقہ وارانہ سر پھٹول کا آغاز کردیں لیکن ان کی یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی ۔ دوسرا یہ ہوا کہ مغربی تعلیم یافتہ طبقہ نے سیاست میں بد ترین قسم کے رجعت پسندوں کا مسلک اختیار کیا ۔ ہر نئی چیز مثلاً براہ راست انتخابات ' صوبائی خود مختاری اور سیاسی جماعتوں کو تو حرام قرار دیا مگر سیاست میں اس فرسودہ روش کے باوجود تہذیبی زندگی میں مغرب کی اندھی نقالی کو فیشن بنا لیا اور کوشش یہ کی کہ مسلمان اپنے ماضی سے کٹ جائیں ۔ کسی نے کہا کہ قرآن کافی ہے ' حدیث کی ضرورت نہیں ۔ بعض نے نکتہ آفرینی کی کہ جب قرآن و حدیث موجود ہے تو پھر فقہ اور فقہائے کرام کی مصیبت ہم کیوں اپنے گلے میں ڈالیں اور ایسے لوگ بھی تھے کہ قرآن ' حدیث اور فقہ کے تو قائل رہے مگر تصوف کا انکار کیا اور اسے خرافات قرار دیا ۔

ان تجدد پسندوں کا نیا اسلام ' عام مسلمان

قبول نہیں کرسکتا تھا اس لئے وہ پرویزی لٹریچر ' ایوبی حکومت اور مولوی کے مذہب کے علی الرغم تمام تحریکوں کی کارگزاری کے باوجود مولوی ہی کو دین کا صحیح نمائندہ سمجھتا رہا ۔ سچ پوچھئے تو بے جا قسم کے تجدد پسندوں نے مسلمانوں کو قدامت کے پرستار مولویوں کی جانب خود ہی دھکیل دیا ۔ پھر مولوی کے ہاتھوں میں جمہوریت کا جھنڈا بھی آگیا ' قومی تاریخ اور کلچر کی حفاظت کا بھی اور اسلام کا بھی تو اس مولوی نے تجدد پسند طبقہ پر فتح حاصل کر لی ۔ اس فتح کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلم لیگ ختم ہوگئی جو مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اور جدیدیت کے حامیوں نے پیدا کی تھی اور اس کی جگہ مولویوں کی جمعیتیں ابھر کر آگئیں جو اصل میں کہیں باہر سے نہیں آئی تھیں نہ اچانک پیدا ہوئی تھیں بلکہ مسلم معاشرہ کے اندر پہلے سے موجود تھیں اور مسلم لیگ کا خانہ خالی ہوتے ہی ابھر کر سامنے آن کھڑی ہوئی ۔

تجدد کی دلدادہ پیپلزپارٹی نے مسلم لیگ کی جگہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہی اور آخر میں بھٹو صاحب نے مولویوں سے مل کر اپنی جان بچانا چاہی تھی لیکن مولوی نے انہیں قبول نہیں کیا۔

"مولوی" کا پاکستانی معاشرہ میں ابھر آنا ایک لحاظ سے اچھا تھا تو دوسرے اعتبار سے برا بھی تھا کہ یہ مولوی حضرات اپنے اپنے مکاتب فکر کی عصبیتوں میں بھی حد درجے پکے تھے اور ان میں جو غلو پایا جاتا تھا اس کا اثر مسلمانوں کے عام اذہان پر بھی ہوا ۔ اصل میں یہ توقع تو مغربی تعلیم یافتہ طبقہ سے تھی کہ وہ مولوی کی متبادل کوئی قیادت پیش کرسکے گا جس میں وہ ناکام رہا ورنہ صحیح معنوں میں ایک نئی اسلامی قیادت یا مسلم قیادت ابھرتی تو وہ اپنے آپ کو فرقہ وارانہ بحثوں اور جنگ و جدل سے الگ رکھتی اور قوم کو بھی اس راستے پر جانے سے بچاتی لیکن نہ کوئی نئی مسلم قیادت سامنے آئی اور نہ اسلامی قیادت۔ اسلامی تحریک کے رہنما اور کارکن یقیناً خود فرقہ واریت کے زہر سے بڑی حد تک محفوظ تھے لیکن ان میں یہ ہمت اور صلاحیت نہیں تھی کہ جو بڑے بڑے مولانا حضرات فرقہ واریت کے کارخانے چلا رہے ہیں ' ان کے خلاف لب کشائی کرسکیں اس لئے یہ کارخانے چلتے رہے اور ۷۰ء کے انتخابات میں کافی طاقت پکڑ گئے ۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ سارے کے سارے

... اور آخر میں بھٹو صاحب نے مولویوں سے مل کر اپنی جان بچانا چاہی تھی لیکن مولوی نے انہیں قبول نہیں کیا!

مولوی فرقہ وارانہ جنگ و جدل کے شائق تھے ' اوپر کی سطح پر اتحاد بین المسلمین کی ایک خواہش ضرور موجود تھی لیکن ایک تو اس خواہش کے تحت نہ کوئی فارمولا بنا نہ کوئی پیش رفت کی گئی۔ دوسرا یہ کہ نچلی سطح پر آکر فرقہ وارانہ جوش و خروش میں اور بھی اضافہ ہوجاتا تھا ۔ پنجاب اور سرحد میں جمعیت العلمائے ہند اور مجلس احرار بڑی جماعتیں تھیں ۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے بڑا کام کیا لیکن مسلم لیگ کے ہاتھوں شکست کھاجانے کے بعد ان جماعتوں کی صورت بھی مسخ ہونے لگی اور ان مسخ شدہ صورتوں میں ایک صورت فرقہ واریت پھیلانے والوں کی بھی تھی ۔

ایک غضب یہ ہوا کہ حکومت اور بیورو کریسی میں شیعہ حضرات نے اپنے آپ کو طاقتور سمجھ کر اپنی قوت کا اظہار ضروری سمجھا ' اس کا بھی برا رد عمل ہوا ۔ اس دوران صدر ضیاء آئے تو انہوں نے صف اول کے مولویوں اور اسلامی قیادت کو تو نظر انداز کیا لیکن دوسری تیسری اور چوتھی صف پر شب خون مارا اور انہیں اغوا کر کے لے گئے ۔ ان لوگوں نے قومی سیاسی جماعتوں کا توڑ کرنے کے لئے فرقہ واریت کی دکانداری شروع کردی ۔ یہ دکانداری نئی نئی تھی کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور عراق ایران جنگ چھڑ گئی اور عرب ممالک کے سفارت خانوں سے ان دکانداروں کے مال کی اونچی بولیاں لگنے لگیں ۔جواب میں ایران کے سفارت خانے نے بھی اپنا کاروبار شروع کردیا ۔ ابتدا میں ایرانیوں نے جناب خمینی کے غیر فرقہ وارانہ انداز کو اپنایا تھا لیکن صدیوں سے ایرانی قوم پرستی اور فرقہ واریت ہم قدم رہی ہے اس لئے ایرانیوں کی "اسلامیت" بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکی اور انہوں نے پاکستان میں براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر فرقہ واریت کو تقویت پہنچائی ۔ یہ فرقہ واریت اب صرف تہران ' کابل اور اسلام آباد کا مسئلہ نہیں ' وسط ایشیا کے نو آزاد ملکوں میں بھی یہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے چیلنج ہے ۔

فرقہ واریت کے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ :

۱۔ غیر حقیقت پسندانہ سوچ نہ اختیار کی جائے کیونکہ فرقے ختم نہیں ہوسکتے۔ غیر جماعتی سیاست کی طرح غیر فرقہ وارانہ اسلام بھی ممکن نہیں ۔ فرقے صدیوں سے موجود ہیں اور موجود رہیں گے ۔ فرقوں کا وجود بذات خود برائی نہیں ' برائی یہ ہے کہ فرقوں کے مفادات میں ہم آہنگی نہ ہو اور تصادم پیدا ہوجائے یا ان کے سوچنے کا انداز اخوت اور رواداری کے جذبہ سے خالی ہو۔

۲۔ مذہبی رہنما اپنا اپنا اسلام ضرور پھیلائیں ' اپنے مخصوص مکتب فکر کے لئے بھی کام کریں لیکن ساتھ ہی اپنے پیروؤں پر یہ بھی واضح کریں کہ فرقہ وارانہ عناصر شیطانی چیز ہے جس سے دامن بچانا چاہیے ۔ پھر یہ کہ پاکستان کی یک جہتی کا بھی تقاضا ہے کہ مسلمان فرقہ وارانہ منافرت اور جنگ و جدل سے باز رہیں ۔ مساجد اور امام بارگاہوں کو فرقہ ورانہ جنگ کا مرکز نہیں بننا چاہیے ۔ یہ بھی بتانا چاہیے کہ اسلام انسان کے ساتھ محبت اور انسان کی خدمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ایک بے گناہ انسان کے قتل کو ساری انسانیت کا قتل سمجھتا ہے ۔

۳۔ سیاسی رہنما اور جماعتیں اپنے محدود سیاسی مفادات کے لئے فرقہ پرست عناصر سے کوئی مصالحت یا مداہنت نہ کریں ۔ عوام میں فرقہ پرستی کی صاف صاف مذمت کی جائے ورنہ فرقہ پرست طاقتور ہوجائیں گے اور سیاسی لوگ کہیں کے نہیں رہیں گے ۔

۴۔ اخبارات پر فرقہ پرست تنظیموں کا شدید دباؤ ہے ۔ ان کے بیانات اور پریس ریلیز شائع نہ ہوں تو وہ حملے کی دھمکیاں دیتے ہیں ۔ اخبارات اس دباؤ کے آگے جھکنے پر آمادہ نہ ہوں بلکہ اس کا مقابلہ کریں اور اسی طرح فرقہ واریت کی جانب مصلحت آمیز خاموشی نہ اختیار کریں بلکہ اس کے خلاف رائے عامہ تیار کرنے کا فریضہ انجام دیں ۔

اگر یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو پاکستان جو پہلے ہی سندھ میں لسانی عصبیتوں کے بھنور میں ہے ' پنجاب اور سرحد میں فرقہ واریت کے ہاتھوں ڈوب جائے گا اور فرقہ واریت کا یہ پانی اب سر سے اونچا ہوتا صاف نظر آرہا ہے ۔○○

کیا عہد حاضر کی اسلامی ریاست دور خلافت راشدہ کا ہو بہو چربہ ہوگی؟

اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار

آسمانی ہدایت اور تمدنی ارتقاء کے ثمرات کو یک جا کر دیا جائے تو

"زمین پر آسمان کی بادشاہت" قائم ہو جائے گی

ڈاکٹر اسرار احمد

(روزنامہ نوائے وقت کے شکریے کے ساتھ)

حال ہی میں ایک اعلیٰ سطحی سرکاری تربیتی ادارے میں خطاب کی دعوت ملی۔ وہاں گفتگو کے لئے جو موضوع دیا گیا وہ بہت دلچسپ تھا۔ یہ موضوع دو اجزاء پر مشتمل تھا: یعنی ایک "اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار" اور دوسرا "پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار"--- گویا ایک بحث خالص علمی اور اصولی تھی اور دوسری واقعاتی اور تجزیاتی' وہاں ان دونوں موضوعات پر جو کچھ عرض کیا گیا اسے کسی قدر حک و اضافہ کے ساتھ سلسلہ وار ہدیہ قارئین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ آج اس موضوع کے حصہ اول سے متعلق گفتگو ہوگی۔ پھر عہد حاضر کی مثالی اسلامی ریاست کا خاکہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔

بعض مذہبی حلقوں کی جانب سے یہ رائے بہت شد و مد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے کہ اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا وجود جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تفرقہ اور انتشار کا سبب بنتی ہیں جبکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تفرقہ اور تحزب کے قبیل کی چیزیں فتنہ اور شرک کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس رائے کے حامل حضرات اپنے موقف کی تائید میں نہ صرف یہ کہ تفرقہ اور اختلاف کی مذمت میں وارد شدہ جملہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کرتے ہیں بلکہ اپنی رائے کو اتحاد و اتفاق کی تحسین و ترغیب پر مشتمل آیات و احادیث کے ذریعے مزید موکد کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان حضرات کا موقف یہ بھی ہے کہ سیاسی جماعتوں کا وجود اصلاً موجودہ انتخابی نظام کا حصہ ہے اور یہ نظام امید واری کی اساس پر قائم ہے جو اسلام کی رو سے حرام ہے اس طرح یہ پورا سلسلہ بنائے فاسد علی الفاسد کی کامل مثال ہے۔

جہاں تک اس موقف کے جزو اول کا تعلق ہے یقیناً جو حضرات یہ رائے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی اس رائے پر بہت پہلے سے قائم ہوں گے لیکن امر واقعہ بہر حال یہ ہے کہ اس رائے کا اظہار سابق صدر پاکستان' جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں ہوا جو خود بھی اس کے حامی ہی نہیں پر جوش مبلغ تھے۔ پھر جنرل صاحب موصوف کی یہ رائے بھی' ہو سکتا ہے کہ' اصولی موقف پر مبنی ہو لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ان کی ذاتی اور وقتی مصلحت کے بھی عین مطابق تھی۔

رہا اس مرکب رائے کا جزو ثانی' یعنی امید واری کی حرمت تو یہ موقف سب سے پہلے جماعت اسلامی نے ۱۹۵۰-۵۱ء میں قیام پاکستان کے بعد ہونے والے پہلے انتخابات کے موقع پر اختیار کیا تھا جو پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لئے ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی نے تو ان انتخابات کے نتائج کے پیش نظر اپنے پورے طریق اور اپنی جملہ آراء (مثلاً امید واری حرام ہے۔ اور پارٹی ٹکٹ لعنت ہے!) سے عملاً رجوع کر لیا تھا لیکن بعض حضرات تا حال اس موقف کی صحت اور درستی کے قائل ہیں اور اس کے ضمن میں بھی ان کی جانب سے جہاں قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں دنیا میں ذاتی علو اور بالادستی کی طلب کو موجب فساد قرار دیا گیا ہے (جیسے سورۂ قصص کی آیت نمبر ۸۳) وہاں ان احادیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جن میں عہدہ کے حصول کی خواہش یا سوال کی مذمت کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ آراء چند در چند مغالطوں پر مبنی ہیں اور اگر ہم پاکستان میں واقعۃ ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں تو ہمیں ان مغالطوں کے ازالے کے لئے کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم کے ذہین اور فہیم عناصر کے شکوک و شبہات رفع ہوں اور اسلام کے نظام حکومت و سیاست کی جانب پیش قدمی کی راہ ہموار ہو سکے۔

خلافت راشدہ کے خصائص

اس سلسلہ میں اولین اور عظیم ترین مغالطہ جو اکثر لوگوں کو لاحق ہوا ہے یہ ہے کہ شاید عہد حاضر کی اسلامی ریاست دور خلافت راشدہ کے نظام حکومت کا ہو بہو چربہ یا کاربن کاپی ہوگی لہٰذا سب سے پہلے اسی پر گفتگو مناسب ہے۔

پہلی خصوصیت: دور نبوت کا ضمیمہ

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک جانب خلافت راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہد زریں کی

حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دور خلافت راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظام حکومت میں تو جزو لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود میں نہیں آسکتے' مثلاً اولین اور اہم ترین یہ کہ دور خلافت راشدہ دور نبوت کا ضمیمہ تھا اور اس وقت کا معاشرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تربیت و تزکیہ کے مبارک اثرات و ثمرات سے مالا مال تھا۔ اب نہ دنیا میں دوبارہ دور نبوت آئے گا نہ اس کے سے آثار و برکات کا حامل ضمیمہ یا تتمہ!

دوسری خصوصیت:

صحابہؓ کی درجہ بندی

ثانیاً--- دور خلافت راشدہ میں ہمیں اشخاص و افراد کے مابین ایک درجہ بندی نظر آتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران کی گئی جان گسل انقلابی جدوجہد کے دوران سبقت الی الایمان ' اور ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں صبر و مصابرت ' ایثار و انفاق ' اور سرفروشی و جانفشانی کی کیفیت و کمیت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی ۔ چنانچہ چوٹی پر وہ دس صحابہ کرامؓ تھے جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں ' پھر اصحاب بدر کا درجہ تھا' ان کے بعد اصحاب بیعت رضوان کا شمار تھا ۔ وقس علی ذلک۔ اب ظاہر ہے کہ یہ درجہ بندی نہ صرف یہ کہ فی الوقت موجود نہیں بلکہ آئندہ بھی اگر کوئی جدوجہد اصولی اعتبار سے انقلاب نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہج اور منہاج پر ہوئی تب بھی اگرچہ اس کے کارکنوں میں ایک فطری درجہ بندی تو لازماً قائم ہوگی لیکن اس کے لئے اس قسم کی "سند" کا وجود میں آنا محال مطلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و فرمودات کی بنیاد پر جملہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بحیثیت مجموعی اور مختلف صحابہ کو اپنے اپنے مرتبہ و مقام کے اعتبار سے انفرادی اور شخصی حیثیت سے حاصل تھی۔

سنت خلفاء راشدین کا اتباع لازم

دور خلافت راشدہ کے اس قسم کے خصائص کی بنا پر ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان مبارک میں خلفاء راشدین کی سنت کو اپنی سنت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے نتھی کردیا ہے کہ :" تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت اسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑے رکھو!" (ترمذی ' ابوداؤد عن عرباض ابن ساریہؓ) چنانچہ اسی بنا پر فقہاء کرام نے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کو اجماع کا درجہ دے کر ہمیشہ کے لئے واجب الالتزام قرار دیا ہے ۔ (حال ہی میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ بالقابہ نے لاہور میں منعقدہ بعض مجالس میں ' جن میں سے دو میں راقم خود بھی شریک اور براہ راست سامع تھا' اجماع کو "فکشن" یعنی محض افسانہ قرار دیا ہے تو ان کی یہ رائے بھی بعض دوسری آراء کی مانند نہ صرف یہ کہ ناواقفیت کی دلیل ہے بلکہ ناروا جسارت کی بھی مظہر ہے ۔ اس لئے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں ایک جانب پورا عالم اسلامی ایک سیاسی وحدت تھا' تو دوسری جانب نہ ابھی فرقے وجود میں آئے تھے اور نہ فقہی مسالک ' بنا بریں اس وقت خلفاء راشدین کے جس اجتہاد کو امت نے قبول کرلیا تھا وہ لازماً "اجماع" کی حیثیت رکھتا ہے!)

قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء

دور خلافت راشدہ کے ان مثبت خصائص کے ساتھ ساتھ اس امر واقعی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری تاریخ کا عہد زریں اور دینی اور فقہی اعتبار سے حجت ہونے کے باوجود وہ زمان و مکان اور ظروف و احوال کے ایک خاص پس منظر کا حامل ہے چنانچہ جہاں یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ چونکہ اس وقت کا معاشرہ خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھا لہٰذا اس دور کا نظام مشاورت بھی لامحالہ اسی کی اساس پر استوار تھا' اور کسی گھرانے کے سربراہ یا قبیلے کے شیخ کی رائے معلوم ہوجانے کے بعد اس کے ایک ایک فرد سے رائے لینا سوائے وقت اور وسائل کے ضیاع کے اور کچھ نہ تھا' وہاں یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل نوع انسانی بحیثیت مجموعی کم از کم سیاسی شعور کے اعتبار سے عہد طفولیت میں تھی اور ابھی سیاسی اداروں کے نشو و نما کا عمل جاری تھا جس کا سب سے نمایاں مظہر یہ ہے کہ نہ صرف اس وقت بلکہ بعد میں بھی بہت طویل عرصے تک "ریاست" اور "حکومت" کے مابین کسی فرق و تفاوت کا فہم اور شعور نوع انسانی کو حاصل نہ ہوا تھا جس کا لازمی اور منطقی ' اور نہایت خوفناک ' نتیجہ یہ تھا کہ حکومت وقت کی مخالفت لامحالہ "بغاوت" ہی شمار ہوتی تھی ۔ (اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہی اصل سبب تھا کربلا کے حادثہ فاجعہ کا اور اس کے بعد کے ان متعدد حوادث کا جو حکومت کی تبدیلی کی کوشش کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے۔)

اس سلسلہ میں ہمیں اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ اگرچہ مسلمان عربوں نے فلسفہ ' ریاضی ' فلکیات اور طب وغیرہ جملہ علوم زیادہ تر یونان اور کسی قدر ہند سے حاصل کرکے انہیں پروان چڑھایا اور ترقی دی اور پھر ان علوم کو ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے وسطی یورپ کی اقوام ' خصوصاً اہل فرانس اور جرمنی' کو منتقل کیا --- چنانچہ اسی کے نتیجہ میں اصلاح مذہب کی تحریک بھی برپا ہوئی اور احیاء علوم کی بھی' لیکن اس کے بعد ہم نہ صرف لمبی تان کر سو رہے بلکہ عیش و عشرت میں محو ہوگئے ۔ اور پھر جملہ علوم و فنون کا ارتقاء یورپ ہی میں ہوا ۔ چنانچہ وہیں سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی جس کے نتیجے میں انکشافات و ایجادات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کی بلندیاں اب ـ؟ عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں- کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!" کے مصداق آسمانوں سے باتیں کررہی ہیں اور وہیں تمدنی اور سیاسی ارتقاء کا عمل آگے بڑھا جس کے نتیجہ میں انسانی حقوق کا تصور بھی پروان چڑھا اور سیاسی ادارے بھی وجود میں آئے۔ اب اگر ہم یورپ کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور زیادہ سے زیادہ یہی اصول اپناتے ہیں کہ نئی ایجادات کا استعمال شریعت کے حدود کے اندر ہونا چاہیے تو یہی اصول ہمیں مغرب کے تمدنی ارتقاء کے ثمرات کے ضمن میں بھی اختیار کرنا چاہیے کہ ان اداروں یا ان کے معمولات میں سے جو بھی قرآن و سنت کے واضح نصوص کی روشنی میں کلی یا جزوی طور پر "حرام" قرار پائیں ان سے تو لازماً اجتناب کریں لیکن باقی سے خواہ مخواہ الرجک نہ ہوں ۔

تاریخ کا حقیقت پسندانہ مطالعہ

دور خلافت راشدہ کے ضمن میں ایک تیسری حقیقت یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سے جو محبت اور عقیدت ہمارے دلوں میں ہے (اور ہونی چاہیے!) اسے اس دور کے حالات و واقعات کو حقیقی واقعاتی پس منظر میں دیکھنے کی راہ میں حجاب نہیں بننا چاہیے۔ اگر ہم ذرا دیر کے لئے تقدس کے پردے کو ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ اس دور میں بھی سیاسی پارٹیاں موجود تھیں اور اگرچہ ابتداء میں وہ خالص قبائلی بنیاد پر قائم تھیں' جیسے مہاجرین و انصار' یا اوس و خزرج' یا بنو ہاشم اور بنو امیہ وغیرہ--- تاہم کچھ ہی عرصے بعد ان میں شخصیات کا عمل دخل نمایاں ہوگیا تھا۔ چنانچہ شیعان علیؓ اور شیعان عثمانؓ دو پارٹیاں وجود میں آگئیں جو ابتداء میں خالص سیاسی اختلافات کی بنا پر ہی وجود میں آئی تھیں۔ ان کی بنا پر مذہبی اور اعتقادی تفرقہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔

اسی طرح "امید واری" اس دور میں جس طرح حرام قرار دی جارہی ہے اس میں بھی واقعات و حقائق سے صاف اور صریح گریز نظر آتا ہے اس لئے کہ جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کا معاملہ' ہے سب جانتے ہیں کہ وہ خالص ہنگامی حالات میں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاریؒ اور مسند احمد ابن حنبلؒ میں وارد روایات کے مطابق حضرت عمرؓ نے صراحۃ واضح کردیا تھا کہ اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا اور مسلمانوں کے مشورے کے بغیر خلافت کا فیصلہ گویا مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کے مترادف ہوگا! اسی طرح حضرت عمرؓ کا معاملہ بھی استثنائی ہے اس لئے کہ وہ بجائے خود بھی ایک غیر تنازعہ اور متفق علیہ شخصیت کے حامل تھے پھر ان کا انتخاب نہیں ہوا بلکہ انہیں حضرت ابوبکرؓ نے اصحاب حل و عقد سے استصواب اور مشورے کے بعد نامزد کردیا تھا۔ لیکن خلیفہ ثالث کے انتخاب کا معاملہ مختلف تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی کے لئے انشراح صدر کے ساتھ فیصلہ نہ کرپائے تو انہوں نے معاملہ ان صحابہؓ کے حوالہ کردیا جو عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت موجود تھے --- کہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ چن لیں (یہ ایک نہایت فیصلہ کن مثال ہے اس دور میں موجود درجہ بندی کی!) گویا یہ اس وقت کا "الیکٹورل کالج" تھا۔

اب یہ تفصیل سب کے علم میں ہے کہ ان حضرات میں سے تین نے بقیہ تین کے حق میں "دستبرداری" کا اعلان کردیا' بقیہ تین میں سے بھی ایک (حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ) نے اعلان کردیا کہ اگر باقی دو حضرات فیصلے کا اختیار انہیں دے دیں تو وہ بھی "دستبردار" ہوجائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا' تو بتایئے کہ بقیہ دو حضرات جدید اصطلاح کے مطابق "امید وار" کے سوا اور کیا قرار پائیں گے؟ اگرچہ یہ "امیدواری" معاذ اللہ' حکومت اور اقتدار کی حرص اور ذاتی علو و سربلندی کی خواہش کی بنا پر ہرگز نہ تھی بلکہ اپنی اپنی ترجیحات کے مطابق ملک و ملت کو بہتر سے بہتر انتظامی ڈھانچہ عطا کرنے اور اپنی اپنی خدا داد صلاحیتوں و استعدادات کی مناسبت سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے تھی۔

اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق

ایک دوسرا خلط مبحث جو اس قسم کے معاملات میں بالعموم پیش آتا ہے وہ اسلام کی اخلاقی و روحانی اور فقہی و قانونی تعلیمات کے مابین فرق نہ کرنے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کی ان دونوں سطحوں کی تعلیمات اکثر و بیشتر معاملات میں مختلف' اور بعض معاملات میں تو متضاد تک ہوتی ہیں اور اگر ان کے مابین فرق و امتیاز قائم نہ رکھا جائے تو بسا اوقات خالص نیک نیتی کے تحت بھی نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے مغالطے پیدا ہوجاتے ہیں بلکہ عظیم فتنے رونما ہوجاتے ہیں' مثلاً اخلاقی سطح پر تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اللہ کی قسم کھا کر اس شخص کے ایمان کی مطلق نفی فرمائی ہے جس کی کج خلقی کے باعث اس کا پڑوسی امن اور چین میں نہ ہو' لیکن ظاہر ہے کہ اس کی بنا پر کسی کو غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اور اسی قسم کی احادیث کی بنا پر خلط مبحث باعث خوارج ایسا انتہائی گمراہ فرقہ وجود میں آیا جس نے ایک عظیم فتنے کی صورت اختیار کرلی۔

اسی طرح روحانی اور احسانی سطح پر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زائد ہو اللہ کی راہ میں دے دیا جائے اور اپنے پاس مال جمع نہ کیا جائے' دوسری طرف قانونی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حلال ذرائع سے جو کچھ کماؤ اس میں سے صرف زکوٰۃ تو لازماً وصول کرلی جائے گی باقی کے ضمن میں تمہیں اختیار حاصل ہے کہ چاہو تو از خود اللہ کی راہ میں دے دو اور چاہو تو اپنے پاس رکھ لو --- چنانچہ اسی پر زکوٰۃ اور میراث کے شرعی احکام نافذ ہوتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ آیت کنز ہی کی بنا پر خالص نیک نیتی سے حضرت ابوذرؓ اس رائے کے شدت سے قائل ہوگئے تھے کہ چاندی سونے کی کوئی بھی مقدار اپنے پاس رکھنا حرام مطلق ہے۔ یہی معاملہ تفرقہ و انتشار کی مذمت اور اتحاد اور اتفاق کی ترغیب یا اقتدار کے حرص یا علو ذات کی خواہش کی مذمت کا ہے۔ یہ ایک اصولی اور اخلاقی تعلیم ہے۔ لیکن نہ شعوب و قبائل کی تقسیم و تمیز اس کے منافی ہے جسے اللہ نے خود اپنی جانب منسوب کیا ہے' نہ ہی اس کی نفی اس حقیقت واقعی سے ہوتی ہے کہ معاشرے کا ہر خاندان ایک نیم آزاد (آٹونومس) تنظیمی وحدت ہے جس کا سربراہ اپنی جگہ "والی امر" اور حدیث نبویؐ کے الفاظ میں "راعی" ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے ملکی و قومی مسائل' خارجی اور داخلی حکمت عملی' اور قومی آمد و خرچ (بجٹ) کے ضمن میں ترجیحات کے فرق کی بنیاد پر لوگ علیحدہ علیحدہ سیاسی جماعتوں کی صورت میں منظم ہوں تو جب تک ہر جماعت اور تنظیم کتاب و سنت کے حدود کے اندر اندر رہنے کی پابندی کا اقرار و اعلان کرے' اس میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے اور قرآن و سنت کی کوئی نص صریح ایسی نہیں ہے جس سے اس کی حرمت ثابت ہو۔

ہمارا اصل مسئلہ: اخلاق کا زوال

اس مسئلے میں مغالطے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ ہم جب بھی ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں ہمارے پیش نظر اپنا ماحول ہوتا ہے اور ہم اپنے یہاں کی سیاسی جماعتوں کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے رائے قائم کرتے ہیں - حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اصولی حیثیت کو سامنے رکھا جائے ورنہ ہمارے ہاں جو پیشے مقدس سمجھے جاتے ہیں اگر ان سے وابستہ لوگوں کی بھی اکثریت کے کردار کو سامنے رکھا جائے تو شاید رائے اکثر حالات میں برعکس قائم کرنی پڑے۔ اسی پر سیاسی جماعتوں کے کردار کو قیاس کرنا چاہیے کہ اصل خرابی قومی سطح پر کردار اور اخلاق کے زوال' دیانت و امانت کے فقدان' اور ایفاء عہد کے عنقا ہوجانے کی ہے' جس پر مستزاد ہے

سیاسی شعور کی کمی اور سیاسی جماعتوں کے استحکام کی راہ میں بار بار کے مارشل لاء کے ادوار کے باعث رکاوٹ ' جس کی بنا پر ہم سیاسی اعتبار سے بحیثیت مجموعی ایک نابالغ ' قوم بن کر رہ گئے ہیں اور ملکی سیاست نے خالص ذاتی مفادات کے کھیل کی صورت اختیار کرلی ہے اس کے برعکس متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کی سیاسی جماعتوں کو دیکھئے کہ داخلی طور پر کتنی مستحکم اور منظم ہوتی ہیں اور عوامی سطح پر ملک و قوم کے مسائل کے ضمن میں لوگوں کو سوچنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور سیاسی و قومی معاملات کے ضمن میں تعلیم بالغاں کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔

حاصل کلام

اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں عہد حاضر کی اسلامی ریاست کے ضمن میں قرآن اور سنت اور دور خلافت راشدہ سے بنیادی اصول اخذ کرنے ہوں گے اور ان کے ساتھ انسان کے تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آنے والے جملہ اداروں کی پیوند کاری کرنی ہوگی اس شرط کے ساتھ کہ ان کے اصول و قواعد ' یا معمولات و روایات میں جو چیزیں قرآن و سنت کے نصوص کی رو سے حرام ہوں ان کی قطع و برید اور تراش خراش کردی جائے ۔ اس لئے کہ جن اعلیٰ اقدار تک انسان نے اپنے اس طویل تمدنی ارتقاء کے ذریعے رسائی حاصل کی ہے واقعہ یہ ہے کہ وہ سب علامہ اقبال کے قول کے مطابق اصل میں " نور مصطفیٰ " (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی سے مستعار ہیں اور اس سفر کے دوران انسان نے جو ادارے تشکیل دیئے ہیں وہ نوع انسانی کی مشترک میراث ہیں اور ان اعلیٰ اقدار اور ان سیاسی و تمدنی اداروں کی برکات سے انسان صرف اس لئے محروم رہ گیا ہے ' اور بحر و بر میں فساد اس لئے رونما ہوگیا ہے کہ اس نے فرعون اور نمرود کی پیروی کرتے ہوئے حاکمیت مطلقہ کا مدعی بن کر خود "شارع" یعنی قانون ساز کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔ اور اگر آج بھی آسمانی ہدایت و شریعت اور تمدنی ارتقاء کے ثمرات کو یک جا کر دیا جائے تو بائیبل کی اصطلاح کے مطابق "زمین پر آسمان کی بادشاہت" قائم ہوجائے گی اور وہ عالمی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ وجود میں آجائے گا جس کے قیام کی صریح اور قطعی پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیات کے بارے میں حدیث نبویؐ میں یہ الفاظ مبارکہ بھی وارد ہوئے ہیں کہ :" اس سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی ۔ چنانچہ اس وقت آسمان بھی نعمتوں کی موسلا دھار بارش برسائے گا اور زمین بھی اپنی نباتات و برکات کے سارے خزانے باہر نکال دے گی!"

آئندہ صحبت میں ان شاء اللہ ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول کیا ہیں اور وہ عہد حاضر کے اعلیٰ ترین جمہوری معیارات کی حامل ریاست سے کن کن اعتبارات سے مختلف ہے۔

ضروری اعلان

"ندائے خلافت" کا اگلا شمارہ ایک ہفتے کے وقفے سے شائع ہوگا

حج اور عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں کے باعث ہمارا آئندہ شمارہ دو ہفتوں کے بعد اضافی صفحات کے ساتھ پیش خدمت کیا جائے گا۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔ (ادارہ)

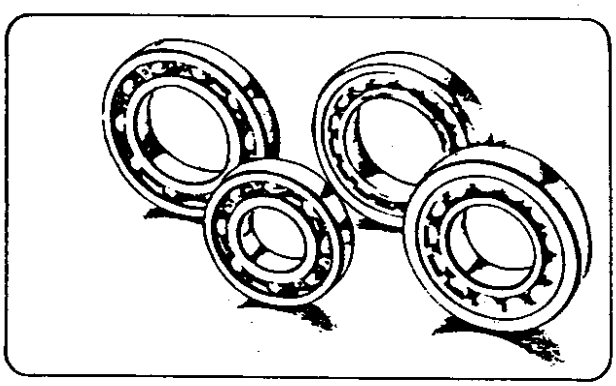

KHALID TRADERS
IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE
AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan) Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

مشرقی پاکستان کو پانچ اور مغربی پاکستان کو متعدد صوبوں میں تقسیم کردیا جاتا تو ملک دولخت نہ ہوتا

پاکستان کے وفاق کا معمہ اور اس کا حل

پاکستان کے موجودہ صوبوں کی اوسط آبادی دنیا میں سب سے زیادہ اور ان کی تعداد دنیا کے تمام ممالک میں سب سے کم ہے (قسط اول)

تحریک خلافت پاکستان نے ملک خداداد کے استحکام کے پیش نظر جو یہاں قیام خلافت اسلامیہ کی شرط اول ہے ' موجودہ صوبوں کو توڑ کر نئی بنیادوں پر چھوٹے صوبوں کی تشکیل کی بات کی تو بہت سی پیشانیوں پر بل پڑ گئے لیکن ملک و قوم کے بہی خواہوں نے اس موضوع کو پہلے بھی چھیڑا اور بہت مضبوط دلائل کے ذریعے ثابت کیا تھا کہ ہمارے بہت سے مسائل کا حل چھوٹے صوبوں کی نئی حد بندی میں ہے ۔ یکم جون ۱۹۹۰ء کے "جنگ" کراچی میں مرزا جواد بیگ صاحب کا ایک مفصل اور مبسوط مقالہ اسی موضوع پر شائع ہوا تھا جس میں ان کے پیش کردہ موقف کی صداقت آج دو سال بعد بھی اتنی ہی مبرہن ہے جتنے پہلے تھی --- (مدیر)

حصول آزادی کے بعد سے اب تک ہماری تاریخ کا ۴۳ سالہ مختصر دور متواتر ایسے عدم استحکام اور انتشار کا شکار رہا ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس مختصر سی مدت میں تین بار مارشل لاء لگا اور تین ہی بار بھارت کے ساتھ لاحاصل جنگیں ہوئیں ۔ نیز ہماری قومی زندگی کے اس چھوٹے سے دور میں ہم پر چار گورنر جنرلوں ' تین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں ' ایک سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ' سات صدور اور دس وزیراعظموں نے حکومت کی۔

خاص طور پر قابل غور یہ امر ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد سیاسی وجود کے تینوں ممکنہ گروہوں یعنی سیاست دانوں ' نوکر شاہی اور فوج کو یکے بعد دیگرے اس ملک پر اپنی من مانی حکمرانی کے وافر مواقع حاصل رہے ۔ باوجود اس کے ان میں سے ہر ایک گروپ بنیادی مقاصد کے حصول یعنی قومی انتشار اور عدم استحکام دور کرنے ' صوبائی عصبیت ختم کرنے اور عوام کو ایک منظم قوم میں یکجا کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام کے مسائل دو چند ہوگئے ' شر و فساد میں اضافہ ہوا اور تعمیر و ترقی عنقا ہوگئی ۔ ساتھ ساتھ عوام میں احساس محرومی اور غلبہ کا خوف دوبالا ہوگیا اور قومیتوں کی آوازیں بلند سے بلند ہوتی چلی گئیں ۔

یہ ناکامی یقیناً اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمارے اجتماعی نظام میں کوئی ایسی بنیادی خامی ضرور موجود ہے جو ابھی تک ہماری نظروں سے پوشیدہ اور اوجھل رہنے کے علاوہ مسلسل عدم استحکام پیدا کئے ہوئے ہے اور قوم کے منظم اور متحد ہونے میں رکاوٹ کا باعث بنی ہوئی ہے ۔ آخر یہ خامی اور رکاوٹ کیا ہے ؟ اس اہم راز کا انکشاف اس مضمون کا اصل مقصد اور منشا ہے۔

۱۹۵۵ء سے بار بار راقم الحروف حکومتوں کو اس سلسلہ میں تجاویز پیش کرتا رہا ہے مگر کسی نے انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ آج سارا ملک جس سیاسی ' معاشی اور سماجی انتشار اور بدحالی سے دوچار ہے اس کا تقاضا ہے کہ اب پاکستان میں مسلسل شورش اور عدم استحکام کے اصل اور بنیادی اسباب کا عوام کے سامنے تجزیہ کیا جائے اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ہمارے وفاق کے خدوخال اور اس کی اندرونی اکائیوں(صوبوں) اور دوسرے عوامل کے طرز عمل کے درمیان جو تا حال پوشیدہ اور ان دیکھا تعلق ہے اس کا تعین کیا جاسکے ۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم بلا تاخیر اپنے مسائل کا گہری نظر سے صحیح سمت میں مطالعہ کر کے اصل اور پائیدار حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

غلبہ کا خوف

معرض وجود میں آنے کے بعد پاکستان دو خصوصیات کا حامل تھا ۔ پہلی یہ کہ وہ دو حصوں میں منقسم تھا جن کے درمیان ایک ہزار میل کا معاندانہ علاقہ موجود تھا اور دوسری اس کی آبادی کی خصوصی حیثیت تھی ۔ پہلی صورت تو طبعی حقیقت کی بناء پر سطحی نظر سے ہی واضح تھی اور دوسری صورت حال یعنی مشرقی بازو کی آبادی کی مغربی بازو کی آبادی پر عددی اکثریت بھی کچھ عرصہ بعد نمایاں ہونے لگی تھی جو شروع ہی سے آئینی تعطل کی بنیاد بنی رہی اور جس نے ملک میں صحت مند جمہوری روایات کے فروغ میں ابتدا ہی سے رکاوٹ ڈال دی تھی ۔ اس لئے کہ پہلی آئین ساز اسمبلی کے لئے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ عام انتخابات آئین سازی مکمل ہونے سے قبل ہی کروا دیتی جس کے لئے اسے خاص طور پر منتخب کیا گیا تھا ۔ لیکن ایک ایسے ملک کے لئے آئین سازی کا کام نہایت دشوار تھا جس کی اکائیوں میں آبادی کا نمایاں عدم توازن موجود ہو ۔ تاہم اس مسئلہ پر کافی عرصہ تک بحث و مباحثہ کے بعد آخر کار اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کہ مشرقی بازو ' مغربی پر محض عددی اکثریت کی بناء پر غلبہ حاصل نہ کرسکے ' مغربی بازو کی نو اکائیوں اور مشرق کے واحد صوبے کے درمیان ایک پیچدہ توازن وضع کردیا گیا ۔ بدقسمتی سے جونہی آئین ساز اسمبلی نے اپنا آئین سازی کا کام مکمل کیا تو اچانک وہ ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے جن کی تفصیل میں

جانے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

آئین کے اس پیچدہ توازن پر کسی حد تک مشرقی بازو کے رہنما تو مطمئن ہوگئے تھے مگر مغربی بازو کے مقتدر رہنماؤں کی تشفی مساوات حاصل کر لینے کے باوجود بھی نہ ہو سکی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مشرقی بازو کے واحد یونٹ نے اگر مغربی یونٹوں کے درمیان تفرقہ ڈال کر کسی بھی ایک یونٹ کو اپنے ساتھ ملا لیا تو وہ ملک میں ہمیشہ کے لئے اقتدار پر قابض ہوجائے گا۔ لہٰذا عددی غلبہ کے خوف کے ساتھ ساتھ مغرب کے بھی گرفت سے نکل جانے کے خدشہ کی بناء پر طاقتور مغربی رہنماؤں نے بڑی عجلت میں ایک غیر دانشمندانہ اقدام اٹھایا اور مغربی بازو کی نو اکائیوں کو ختم کر کے ایک واحد صوبہ "ون یونٹ" کے نام سے بنا ڈالا اور کہا یہ گیا کہ اس طرح اخراجات میں زبردست کمی ہوجائے گی حالانکہ بعد میں یہ دعویٰ بالکل غلط ثابت ہوا۔اس مقصد کے حصول کے لئے آئین ساز اسمبلی کو ختم کردیا گیا اور دونوں بازوؤں میں مساوات (پیرٹی) کا ایک ناقابل عمل اور جمہوریت کش طریقہ رائج کیا گیا۔ ان رہنماؤں کے خیال خام میں ان کا وہ اقدام برابری کی بنیاد پر موثر طریقہ سے مشرقی بازو کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل تھا۔ اس طرح وہ معاملہ فہمی کے فقدان اور عاقبت نا اندیشی کی بنا پر کسی متبادل فائدہ مند حل اور امکانات کا جائزہ لیے بغیر بڑی عجلت میں محض غلبہ کے خوف سے ایک ایسے جال میں پھنس گئے کہ جس کے نتیجہ میں ملک دولخت ہوگیا۔

جس دوران اس غیر منطقی وفاق کو عملی جامہ پہنانے کی کارروائی زوروشور سے جاری تھی اور عوام کو سبز باغ دکھائے جا رہے تھے راقم الحروف نے پہلی بار اپنے خط مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ذریعہ اس وقت کے نئے وزیر اعظم چوہدری محمد علی مرحوم کو بروقت متنبہ کر دیا تھا اور ان کی توجہ "ون یونٹ" کے قیام کے خطرات اور محض دو یونٹوں پر مشتمل وفاق کے منفی نتیجہ پر مبذول کرانے کی کوشش کی تھی۔ راقم الحروف نے چوہدری صاحب کو تجویز پیش کی تھی کہ "ون یونٹ" قائم کرنے کی بجائے مشرقی پاکستان کے پانچ اور مغربی پاکستان کے نو مکمل صوبے بنا دیئے جائیں۔ اس طرح غلبہ کا خوف بھی ختم ہو جائے گا اور ملک میں پائیداری اور استحکام کی بنیاد بھی ڈالی جاسکے گی۔ ۱۹۶۱ء میں راقم الحروف نے دوبارہ اس وقت کے صدر ایوب خان کو تحریری منصوبہ پیش کیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو پانچ اور مغربی بازو کو بارہ صوبوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اگر ان تجاویز پر عملدرآمد کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ ۱۹۷۱ء میں ملک کا شیرازہ نہ بکھرتا بلکہ مکمل استحکام حاصل ہو جانے کی بنا پر ہماری قوم اب سے بہت پہلے ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو چکی ہوتی۔ مشرقی پاکستان کے سانحہ کے بعد راقم الحروف نے ۱۹۷۲ء میں "تحریک شہری حکومت" کی بنیاد ڈالی تاکہ سابقہ غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے باقی ماندہ پاکستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کر کے مقامی سطحوں پر بین الاقوامی طرز کی خود مختار حکومتوں کے قیام کی جدوجہد شروع کی جاسکے۔ اس تحریک کی روز افزوں مقبولیت اور کامیابیوں سے خائف ہو کر حکومت وقت نے بوکھلاہٹ میں جھوٹا مقدمہ قائم کرکے راقم الحروف کو غداری کے الزام میں بارہ سال قید بامشقت کی سزا دلوادی۔

بعد میں سپریم کورٹ کے پورے بنچ نے اس سزا کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دیتے ہوئے راقم الحروف کو نہ صرف باعزت طور پر رہا کیا بلکہ اس کی قومی خدمات کو سراہتے ہوئے تحریک کی تعریف بھی کی۔

حقیقت میں اگر ایک طرف مشرقی بازو کے علاقوں سلہٹ، راجشاہی، کھلنا، ڈھاکہ اور چاٹگام پر مشتمل مستحکم اور پائیدار صوبے بنادیئے جاتے اور دوسری طرف "ون یونٹ" جیسا بے ہنگم اور ضخیم صوبہ بنانے کی بجائے مغرب میں بھی اضافی صوبوں کے لئے نئی حد بندیاں کر دی جاتیں تو پھر کوئی ایک صوبہ دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں عددی اقلیت کا حامل نہیں رہتا اور ملک میں اتنے سارے صوبے بن جاتے تو پھر ہر جگہ کے مقامی باشندوں میں اقتصادی اور سماجی مفادات پر مبنی ایک نیا تشخص پیدا ہو جاتا جس طرح ہندوستانی مشرقی پنجاب کے منقسم شدہ اور وہاں کے دوسرے نئے اضافی صوبوں کے عوام میں عرصہ ہوا پیدا ہو چکا ہے۔

بہر حال مغربی پاکستان کی اس وقت کی مقتدر قیادت نے اس سے اتفاق نہیں کیا کہ "ون یونٹ" کا کوئی بہتر، پائیدار اور سود مند متبادل بھی ہے جس سے ملک میں ایک پائیدار توازن قائم کیا جا سکتا تھا۔ ان ناسمجھ رہنماؤں کے ذہنوں میں یہ اہم بات بھی نہیں آئی کہ وہ ایک ایسا کمزور اور ناپائیدار وفاق قائم کرنے جارہے ہیں جس کی محض دو اکائیاں ہیں اور جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی کیونکہ اگر کسی وفاق میں محض دو ہی اکائیاں ہوں تو ان کے درمیان اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور ایک ایسے وفاق کا جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ ہو جلد یا بدیر بکھر جانا یقینی امر ہے۔

بدقسمتی سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھی ہمارے باقی ماندہ ملک میں خدوخال کا گورکھ دھندا جوں کا توں برقرار ہے۔ اب بھی پاکستان کو ہو بہو وہی مسئلہ درپیش ہے کہ صوبہ پنجاب کی آبادی باقی ماندہ تینوں صوبوں کی متحدہ آبادی سے زیادہ ہے چنانچہ اب پھر ہمارے چھوٹے صوبوں کے باشندے خصوصاً وہ جو مقامی زبانوں کی بنیاد پر قومیتوں کا تشخص قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں قدرتی طور پر پنجاب کے غلبہ سے اسی طرح خوف زدہ ہیں جس طرح مغربی پاکستان کے لوگ مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت سے خائف تھے اور بلاشبہ یہ ہی ہمارے چھوٹے صوبوں کے عوام کے احساس عدم تحفظ اور محرومی کا حقیقی سبب ہے جس کی بناء پر وقتاً فوقتاً زیادہ سے زیادہ خود مختاری کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے اور اس مطالبہ میں شدت پیدا کرنے کی خاطر اب "قومیتوں" کا شاخسانہ بھی کھڑا کردیا گیا ہے۔

جسامت کا سحر

مشرقی بازو کے ساتھ مساوات حاصل کر لینے کی جدوجہد کے علاوہ جس تصور نے مغرب کے طاقتور رہنماؤں کو متاثر کیا ہوگا وہ یقیناً "جسامت کا سحر" ہے۔ یہ ہماری ابتدائی تربیت اور انگریزی طرز پر ہماری تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم چھوٹے کے مقابلہ میں بڑے کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی تعریف اور توصیف کرتے ہیں اور اسے اعلیٰ اور ارفع سمجھتے ہیں۔ در حقیقت جو بات اہم ہے وہ "کل" کے مقابلہ میں اس کی اکائیوں کا تناسب ہے۔ چونکہ ہندوستان برصغیر کی حیثیت سے ایک عظیم نظام تھا اس لئے ہمیں بڑے بڑے صوبے برطانوی ہندوستان سے ورثہ میں ملے۔ ایک بڑے نظام میں تو قدرے بڑے بڑے حصے بھی ہو سکتے ہیں مگر جب "کل" کی جسامت ہی چھوٹی ہو جائے جیسے برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان محض پانچواں حصہ رہ گیا تو پھر اس کے حصے بھی اسی مناسبت سے

دنیا کے تمام ممالک کے نام اور ان میں صوبوں کی تعداد

(ذریعہ ۔ ایسبمین ائیر بک ۹۰۔۱۹۸۹ء۔ ۱۲۶واں ایڈیشن)

پاکستان	۴	مصر	۴۲	لاؤس	۱۷	سعودی عرب	۱۴
افغانستان	۳۱	اسلیویڈور	۱۴	لبنان	۶	سینیگال	۱۰
البانیہ	۲۷	حبشہ	۱۵	لوتھو	۱۰	صومالیہ	۱۸
الجیریا	۴۸	فن لینڈ	۱۲	لیریا	۱۲	اسپین	۳۲
انگولا	۱۸	فرانس	۲۲	لیبیا	۸	سری لنکا	۵
ارجنٹائنا	۲۲	گیبون	۵	مڈغاسکر	۶	سوڈان	۶
آسٹریلیا	۸	مشرقی جرمنی	۱۵	ملائشیا	۱۵	سویڈن	۲۴
آسٹریا	۹	مغربی جرمنی	۱۱	مالی	۸	سوئٹزرلینڈ	۲۶
بنگلہ دیش	۲۱	گھانا	۱۰	ماریطانیہ	۷	شام	۱۴
بیلجیم	۸	یونان	۳۱	میکسیکو	۳۲	تائیوان	۱۶
بینن	۶	گاٹیمالا	۱۱	منگولیا	۱۸	تنزانیہ	۲۰
بھوٹان	۱۸	گنی	۲۹	مراکش	۲۸	تھائی لینڈ	۷۳
بولیویا	۹	ہیتی	۹	موزمبیق	۱۱	تیونس	۲۳
برازیل	۲۳	ہنڈروس	۱۸	نمیبیا	۱۶	ترکی	۲۳
بلغاریہ	۲۸	ہانگ کانگ	۱۹	نیپال	۱۴	یوگنڈا	۱۰
برما	۱۴	ہنگری	۲۰	ہالینڈ	۱۳	روس	۴۴
برونڈی	۱۵	ہندوستان	۳۳	نیوزی لینڈ	۲۲	انگلستان	۵۴
کامیرون	۱۰	انڈونیشیا	۲۷	نکاراگوا	۶	امریکہ	۵۳
کینیڈا	۱۲	ایران	۲۴	نائجر	۷	یوراگوئے	۱۹
چاڈ	۱۳	عراق	۱۸	نائجیریا	۱۹	وینیزلا	۲۴
چلی	۱۳	آئرلینڈ	۴	ناروے	۱۹	ویت نام	۴۰
چین	۱۶۵	اسرائیل	۶	پانامہ	۱۰	یمن	۶
کولمبیا	۲۳	اٹلی	۲۲	نیوگنی	۲۰	زائر	۹
کونگو	۵	آیوری کوسٹ	۲۸	پاراگوئے	۱۹	زیمبیا	۹
کوستاریکا	۷	جمائیکا	۱۴	پیرو	۲۴	زمبابوے	۸
کیوبا	۱۴	جاپان	۴۷	فلپائن	۱۳	ایکویڈور	۲۰
چیکوسلواکیا	۱۲	جارڈن	۸	پولینڈ	۴۹	جنوبی کوریا	۱۳
ڈنمارک	۱۶	کینیا	۸	پرتگال	۱۸	روانڈا	۵
ڈومینکن	۲۶	شمالی کوریا	۱۳	رومانیہ	۴۱		

چھوٹے چھوٹے ہو جانے چاہئیں تھے لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا لہٰذا ہمارے وفاقی نظام میں توازن برقرار نہیں رہ سکا ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے موجودہ صوبوں کی اوسط آبادی ساری دنیا میں سب سے زیادہ اور ان کی تعداد تمام دنیا کے ممالک میں سب سے کم ہے۔ ملاحظہ فرمایئے "گوشوارہ"۔ یاد رہے کہ آزادی کے وقت آٹھ صوبے جن میں منقسم پنجاب اور بنگال بھی شامل تھے بھارت کے حصہ میں آئے جب کہ چار صوبے اور بلوچستان کا علاقہ پاکستان کو ملا ۔ بھارتی رہنماؤں نے سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لے کر اپنے آٹھ صوبوں کی تعداد بڑھا کر تینتیس(۳۳) کردی یہاں تک کہ مشرقی پنجاب کو بھی جو ہمارے مغربی پنجاب سے کہیں چھوٹا تھا' تین صوبوں میں تقسیم کردیا گیا۔ مشرقی پنجاب کی مزید تقسیم سے وہاں جو زبردست زرعی' صنعتی اور تجارتی ترقی ہوئی ہے اس کے پیش نظر نہ صرف لامرکزیت کے فوائد اور ثمرات کا بلکہ دونوں ملکوں کے رہنماؤں کی سیاسی اہلیت اور ان کے تدبر اور سوجھ بوجھ کے فرق کا بجا طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگ محض نادانی' لاعلمی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے فقدان کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر پاکستان میں مزید صوبے بنا دیئے جائیں گے تو وہ انتظامی لحاظ سے بہت چھوٹے ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہو گا کہ اگر ملک میں موجودہ چار صوبوں کی جگہ مجوزہ انیس (۱۹) بنا دیئے جائیں تو بھی نہ صرف یہ کہ ان کی آبادیوں کا اوسط پوری دنیا کے ممالک کے صوبوں کی آبادیوں کے اوسط سے زیادہ ہوگا بلکہ دنیا کے بیالیس ترقی یافتہ ممالک کی آبادیوں سے بھی زیادہ ہو گا جن میں ناروے' ڈنمارک' نیوزی لینڈ' فن لینڈ' ہانگ کانگ' لیبیا اور اسرائیل شامل ہیں۔ اسی طرح مجوزہ صوبہ لاہور کی آبادی سعودی عرب' کیوبا' پرتگال' سویڈن' بلغاریہ' ہنگری' بلجیم اور شام جیسے آزاد ممالک سے بھی زیادہ ہوگی اور لطف ہے کہ یہ تمام ممالک یکے بعد دیگرے خود بھی ۱۴۔ ۱۴۔ ۱۸۔ ۲۴۔ ۲۸۔ ۲۰۔ ۸ اور ۱۴ صوبوں میں منقسم ہیں

برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے صوبے اصل میں برطانوی حکمرانوں نے اپنے سامراجی عزائم کے تحت تخلیق کئے تھے چنانچہ مغلوں اور ان سے قبل کے حکمرانوں کے زمانوں میں ان صوبوں کی شکلیں بالکل مختلف تھیں۔ برطانوی دور میں سامراجی ضروریات کے تحت ان پر نوکر شاہی کے ذریعہ حکومت کی جاتی تھی چنانچہ یہ نظریہ کہ کسی انتظامی اکائی یا صوبہ سے "قومیت" کی تشکیل ہوتی ہے کسی بنا پر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ صوبائی حد بندیاں ہر جگہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ حقیقت میں صوبہ کی حدود ہمیشہ متحرک ہوتی ہیں جس میں ڈویژن اور ضلع کی حدود کی طرح ضرورت کے تحت تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر بھارت کے حصہ میں آئے

ہوئے آٹھ صوبوں کو بڑھا کر تینتیس(۳۳) کر دیا گیا ہے اور وہاں یو- پی اور سی - پی کے علاوہ تقریباً تمام ہی صوبوں کی حد بندیاں عرصہ ہوا تبدیل کر کے نئے صوبے قائم کردئے گئے اور سارے ہی نئے صوبوں کے عوام نے خوشی خوشی اپنا نیا تشخص قائم کر کے معاشی اور سماجی بہتری حاصل کرلی۔

اب جہاں تک ہمارے ملک کے صوبوں کا سوال ہے سندھ کے علاقہ کو بمبئی کے صوبہ سے الگ کر کے ۱۹۳۶ء میں علیحدہ صوبہ کی حیثیت دی گئی ۔ بلوچستان کا صوبہ مزید تاخیر سے برطانوی بلوچستان اور چار مقامی ریاستوں کو ملا کر ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اپنی انتظامی ضروریات کے تحت سرحد کا صوبہ پنجاب سے علیحدہ کر کے قائم کیا تھا۔ اسی طرح برصغیر کی تقسیم کے وقت پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی کر دی گئی تھی اور ان منقسم صوبوں کے عوام نے نئے حالات کے تحت اپنا اپنا تشخص ایک عرصہ ہوا قائم کر لیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماضی میں ہمارے موجودہ چاروں صوبوں کی حدود میں وقتاً" فوقتاً" ردوبدل ہوتا رہا ہے اور ہم ماضی قریب میں اپنے صوبوں کے بننے اور تقسیم ہونے کے خود بھی شاہد اور گواہ ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقت کہ صوبائی حد بندیوں میں ردو بدل ساری دنیا میں آئے دن کا معمول ہے ان لوگوں کے پراگندہ دعوؤں کی مکمل نفی کرتی ہے جو موجودہ صوبوں کی سرحدوں کے "مقدس "ہونے کے دعویدار ہیں اور اس بنا پر ہی اپنی "قومیت" کی تشہیر کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ حقیقت ایسے شر پسند عناصر کے دعوؤں کو بھی غلط ثابت کرتی ہے جو یہ مہمل انداز فکر رکھتے ہیں کہ "پاکستان برطانوی ہندوستان سے ملے چند صوبوں کا کنفیڈریشن ہے" چونکہ اگر صوبوں کو قومیت کی بنیاد مان لیا جائے تو پھر اس مناسبت سے امریکہ میں ۵۳' جاپان میں ۴۷' ترکی میں ۲۳' مصر میں ۱۶' افغانستان میں ۳۱' ایران میں ۲۲' فرانس میں ۲۲' کینیڈا میں ۱۲(وغیرہ وغیرہ) قومیتیں ہونی چاہئیں۔

اصل میں ہمارے ملک میں موجودہ صوبائی حدود کو مقدس ٹھہرانے والے اور کنفیڈریشن کا نعرہ لگانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی اقتصادی اور سماجی لائحہ عمل تو موجود نہیں لیکن وہ آسانی کے ساتھ سستے اور اشتعال انگیز سیاسی نعروں کی بیساکھی کا سہارا لے کر چور دروازوں سے سیاسی اکھاڑوں میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں متعدد اشیاء اور مختلف خدمات کی دستیابی میں علاقائی تفریق کوئی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ یہ کم و بیش تمام دنیا کے ممالک میں عام ہے۔ البتہ ہمارے یہاں اس کی بنیادی وجہ وفاق کے بے ہنگم اور بلاتوازن صوبے ہونے کے علاوہ مقامی رہنماؤں کی ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ بنے رہنا بھی ہے۔ درحقیقت دیہی ترقی کے واسطے جو روپیہ فراہم کیا جاتا رہا ہے اس کا ایک بڑا حصہ اس مد میں استعمال ہونے کی بجائے مقامی لیڈروں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے اور جب ایک بار مقامی وڈیرے اور ان کے جی حضوریئے برسراقتدار آ جاتے ہیں تو وہ شہری ٹیکس دہندگان سے حاصل شدہ وسائل دیہی علاقوں پر خرچ کرنے کی بجائے خود ہڑپ کر جاتے ہیں۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ دیہی علاقوں کو مختص شدہ ان رقوم کا زیادہ تر حصہ دوبارہ شہری مراکز میں واپس چلا جاتا ہے کیونکہ عیاش وڈیرے اور ان کے لواحقین یہ دولت سمیٹ کر قریب کے شہروں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اسے اپنی عیاشیوں میں اڑا ڈالتے ہیں۔ چنانچہ مقامی وڈیروں کی اس کجروی کی بناء پر دیہی علاقوں کے محروم افراد کے دلوں میں ان شہریوں کے لئے بلاجواز حسد اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جنہوں نے اپنی محنت' جفاکشی اور دوسری صلاحیتوں کے ذریعہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنا لیا ہے۔ بایں ہمہ مقامی وڈیرے جان بوجھ کر اس تفاوت کو قائم اور دائم رکھنا چاہتے ہیں اور شہری اور دیہی علاقوں کی اس خلیج کو سیاسی اور سماجی لحاظ سے اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شہری اور دیہی علاقوں کا یہ تضاد اور عدم مساوات اصل میں سازشی اور مطلب پرست عناصر کے لئے سیاسی فروغ کا باعث بنا ہوا ہے جو اسے بار بار عام انتخابات کے وقت سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔

بڑی جسامت کے صوبوں میں عوام کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کونسا علاقہ کتنا روپیہ فراہم کر رہا ہے اور یہ کہ روپیہ جا کہاں رہا ہے چنانچہ یہ مسئلہ بھی مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان مزید بدگمانی کا باعث بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی متوازن ترقی سے انکار نہیں کر سکتا لیکن یقیناً کوئی ایسا متبادل نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو ایک جابرانہ قبائلی نظام کی حد تک محدود رہتے ہوئے بھی انتہائی ترقی یافتہ اور اقتصادی لحاظ سے خوشحال بھی ہو۔ ساری دنیا میں مقامی ترقی کی خاطر بیرونی سرمایہ کاروں کے لئے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ انہیں خوش آمدید کہنا پڑتا ہے اور ان کے ساتھ رعایت اور محبت کا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر اس قسم کا امتیازی سلوک ہمارے کم ترقی یافتہ صوبوں میں کبھی روا نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ جن لوگوں کے پاس مالی وسائل' فنی مہارت اور تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن وہ کسی دوسرے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ ان صوبوں میں صنعتیں قائم کرنے سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں ان حالات اور واقعات کا اعادہ نہ ہو جائے جو مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو مشرقی پاکستان میں پیش آئے تھے۔ نتیجتاً" باوجود حکومتوں کی لاتعداد ترغیبات کے یہ علاقے ابھی تک غیر ترقی یافتہ پڑے ہوئے ہیں اور مقامی وڈیرے جو صوبائیت کی آگ بھڑکا کے ایسی صورتحال پیدا کرنے کے مکمل طور پر ذمہ دار ہیں اور وہاں کے غریب عوام کی زبوں حالی پر پھل پھول رہے ہیں وہ اپنے اپنے علاقوں میں پسماندگی کو برقرار رکھ کر استحصال کی کیفیت کو جاری و ساری رکھتے ہوئے ایک جابرانہ سماجی اور اقتصادی نظام کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

ضمانتیں' خود مختاری اور مذہب

یاد رہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ پاکستان کے زیر اثر مشرقی بازو نے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کئے تھے' وہاں کے لوگوں میں مغربی بازو کے خلاف بے اطمینانی اور نفرت کے جذبات اس قدر شدید ہو گئے تھے کہ کسی بھی قسم کی منطق یا ٹھوس حقائق اس خلا کو پر نہیں کر سکے۔ اس کا بنیادی سبب وفاق کے غیر معمولی خدوخال کی بناء پر ہمارے صوبوں کے درمیان خطرناک حد تک عدم توازن تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز حکمرانوں کے دور میں ہمارے صوبوں کی تقسیم زبان اور ثقافت کی بنیاد پر کی گئی تھی جن کو آزادی کے بعد بھی جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ لہٰذا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے افسوسناک تجربہ اور ان واقعات اور حالات نے جن سے باقی ماندہ پاکستان فی الوقت گزر رہا ہے یہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عورت کی سربراہی اور ڈاکٹر حمید اللہ

حالت اضطرار ہو تو اسلام متعدد معاملات میں چھوٹ دیتا ہے

ڈاکٹر وحید عشرت

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دورۂ پاکستان کے حوالے سے کوئی اور تحریر آئندہ شائع نہیں کی جائے گی۔ ان سے اختلاف کے اظہار کا حق ادا ہو چکا ہے' ان کے احترام کا تقاضا ہے کہ اب سکوت اختیار کیا جائے۔۔۔ (مدیر)

اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام لیکچر کے بعد سوالات کے جوابات دیتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ نے یقیناً یہ فرمایا کہ حضورؐ نے مدینے کی ایک خاتون حضرت ام الورقاؓ کو ایک مسجد کی امامت سونپ رکھی تھی اور اس میں موذن مرد تھے۔ اب انہوں نے یقین سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ موذن ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا اذان دے کر کسی ایسی مسجد میں نماز کے لئے چلے جاتے تھے جہاں مرد امامت کے فرائض ادا کر رہا ہو۔ اگر وہاں وہ موذن نماز بھی ادا کرتے ہوں گے تو علیحدہ صف بندی ہو گی۔ اب چونکہ یہ حدیث اس سارے سلسلے میں خاموش ہے تو اس خیال کو زیادہ تقویت ملتی ہے کہ محلے کی یہ مسجد عورتوں کے لئے مخصوص کروائی گئی ہوگی جہاں حضرت ام الورقاؓ کی اقتدا میں مسلمان عورتیں اجتماعی نماز ادا کرتی ہوں گی۔ اب چونکہ عورت کی آواز مرد کی نسبت کمزور ہے اور اسلام نے پسند نہیں کیا کہ عورتوں کی آواز گونجے اور غیر محرموں تک پہنچے۔ لہٰذا موذن کے فرائض مرد نے ادا کئے۔ اس واقعہ سے ڈاکٹر جاوید اقبال اور بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ جب عورت امامت کر سکتی ہے تو ریاست کی سربراہی بھی کر سکتی ہے۔

دوسرا حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ نے رضیہ سلطانہ کا دیا کہ التمش کے نالائق بیٹوں کی وجہ سے رضیہ سلطانہ کو حکمران بنا دیا گیا اور اس وقت کے علماء نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ تیسرا حوالہ ملکہ بلقیس کا ہے کہ جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت سلیمانؑ نے ان کو اقتدار سے الگ نہیں کیا اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ نے کسی اور ملک میں بھی کسی حکمران عورت کے قبول اسلام کا ذکر کیا جسے مسلمانوں نے اقتدار سے نہیں ہٹایا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے سوالات کے جو جوابات دیئے ان سے دو اور باتیں بھی مترشح ہوتی ہیں۔ اوپر دی گئی مثالوں سے ایک تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اسلام اضطرار کی حالت میں جہاں اور معاملات میں چھوٹ دیتا ہے وہاں حکمرانی پر بھی عورت کو قبول کر لیتا ہے جس طرح جان کے چلے جانے کا خطرہ ہو تو ہر حرام چیز کھانے کی بھی اجازت یا درست الفاظ میں رخصت ہے اسی طرح اگر ملت یا امت یا کسی قوم کی ناگریز ضرورت ہو تو عورت کو بطور سربراہ مملکت قبول کیا جا سکتا ہے۔ رضیہ سلطانہ کا جو حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ نے دیا وہ بھی التمش کے بعد برصغیر میں پیدا ہونے والی ایک اضطراری کیفیت کو ہی ظاہر کرتا ہے کیونکہ اگر التمش کے بیٹے اہل ہوتے تو رضیہ سلطانہ کی سربراہی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

جہاں تک ملکہ بلقیس کا تعلق ہے وہ قبول اسلام سے پہلے ہی ملکہ تھیں۔ پھر جب وہ مسلمان ہو گئیں اور حضرت سلیمانؑ کی زوجیت میں آ گئیں تو ان کی ریاست حضرت سلیمانؑ کی سلطنت کا ایک حصہ بن کر ان کی حیثیت ملکہ ہوتے ہوئے بھی ایک گورنر کی ہی رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی بات یہ ہے کہ وہ پہلے سے حکمران تھیں لہٰذا قبول اسلام کے بعد انھیں ہٹانا یوں لگتا ہے جیسے اسلام کا قبول کرنا حکومت کیلئے ان کی نااہلی کی دلیل بن گیا۔ اسلام یہ منفی تاثر اپنے بارے میں پیدا نہیں کرنا چاہتا لہٰذا ان کے استحقاق حکمرانی کو باقی رہنے دیا گیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو یاد ہو گا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے فرمایا تھا کہ اسلامی ریاست میں کوئی شخص اپنے لئے ووٹ طلب نہیں کر سکتا' حکمرانی اور اقتدار کے لئے امیدوار نہیں بن سکتا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں ایسے کسی شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو حکمرانی اور اقتدار کا طالب ہو۔ لہٰذا عورت کی امامت اور عورت کی سربراہی سے کسی ایسی عورت کی وکالت نہیں کی جا سکتی جو خود اقتدار کی طالب ہو اور کسی سیاسی پارٹی کی اس لئے سربراہ ہو کہ اسے ملک کا اقتدار مل جائے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی فکر کے مطابق اقتدار پسند اور حکومت طلب عورت خود اقتدار کے لئے اپنی اہلیت کھو دیتی ہے۔ ہمیں ڈاکٹر حمید اللہ کی صرف اس بات کو نہیں سننا چاہیے جو ہمارے مطلب کی ہے بلکہ ڈاکٹر حمید اللہ کے پورے فکر کو اس کے پورے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

عورت کی سربراہی کا سوال سب سے پہلے پاکستان میں محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابات کے وقت اٹھا تھا محترمہ فاطمہ جناح نے ملک کو ایوبی آمریت سے بچانے کے لئے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ اقتدار کی طالب نہ تھیں۔ انھوں نے انتخابات جیتنے کے بعد دوبارہ انتخابات کروا کر اقتدار قوم کے سپرد کرنے کا واضح اعلان کیا تھا۔ وہ عمر رسیدہ تھیں ان پر پوری قوم کو اعتماد تھا اور ان جیسی عورت کی سربراہی اسلام میں قابل قبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس آمریت کی سیاہ رات میں وہی امید کی ایک کرن تھیں۔ عورت کی سربراہی سے کسی ایسی عورت کے لئے استدلال کرنا جو ایک خاص نظریاتی جماعت کی سربراہ ہو اور اقتدار کے لئے ہر داؤ پیچ کھیلنے کو تیار ہو۔ معاف کیجئے اسلام میں ایسی عورت کی سربراہی کا کوئی جواز اور استدلال موجود نہیں۔ اقتدار کی جنگ پاکستان میں اسلام کے اصولوں پر نہیں ہوتی نہ پاکستان میں اسلامی نظام سیاست و مدنیت نافذ ہے۔ پاکستان اس وقت دوسرے غیر اسلامی اور مسلم ممالک کی طرح ہی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا اکھاڑہ ہے۔ اس میں آپ کودیں یا کوئی عورت' کیا فرق

پڑتا ہے۔ اسلام کو امرت دھارے کی طرح استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اقتدار کی بازی ہر طرح ہو رہی ہے ہر کوئی بازی گر ہے۔ اسلام کو تختہ مشق بنائے بغیر بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔

اب جہاں تک خود ڈاکٹر حمید اللہ کا معاملہ ہے۔ بلا شبہ وہ ایک بڑے عالم' محقق' محدث اور سیرت نگار ہیں مگر پیرس میں برس ہا برس قیام سے ان کے ہاں اسلام کے حوالے سے جو لچک دار روشن خیالی پروان چڑھی ہے وہ تجدد پسند طبائع کے لئے حوصلہ اور حوالہ بن سکتی ہے کہ وہ کلاشنکوف ان کے کندھوں پر رکھ کر اسلام کے جس اصول اور حکم پر جب چاہیں داغ دیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے الحمرا میں کئے گئے ہر سوال کا جواب ایسا حکیمانہ دیا کہ اس سے کوئی واضح بات اخذ نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً لونڈی اور غلام کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ بعض افراد' اقوام اور گروہوں کا یہ حق ہے کہ انہیں غلام اور لونڈی بنا کر رکھا جائے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اسلام نے انھیں یہ حق کب دیا۔ اسلام کے ابتدائی معاشرے میں جو سماجی برائیاں چلی آرہی تھیں اسلام نے انھیں آہستہ آہستہ ختم کرنے کی طرف پیش قدمی کی جبکہ ڈاکٹر حمید اللہ اسے اکیسویں صدی کے دروازے پر کھڑے جائز بلکہ لازم قرار دے رہے ہیں۔

سیاسی نظام کے حوالے سے اسلام نے ہمیشہ شورائیت اور جمہوریت کی بات کی۔ اسلام میں ملوکیت اموی دور میں داخل ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی مسلمانوں نے بیعت کی جو بیلٹ کی ابتدائی صورت تھی اور اس کا طریق کار اس دور کی مسلمانوں نے بیعت کی جو بیلٹ کی ابتدائی صورت تھی اور اس کا طریق کار اس دور کے وسائل اور حالات کے مطابق تھا۔ مسلمانوں میں سے ہر ایک راعی ہے اور خدا کے ہاں جواب دہ۔ لہٰذا مسلمان اقتدار اعلیٰ جس کا سزاوار صرف خدا ہے کے اجتماعی طور پر امین ہیں۔ اور وہ سب ملکر اپنی اجتماعی رائے سے ایسا نظام بنانے کے پابند ہیں جس میں تمام مسلمانوں کی رائے کا احترام ہو' ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ کہنا بہت بڑی زیادتی ہے کہ اسلامی حکومت 'اشرافیہ' ملوکیت 'ڈکٹیٹر شپ' جمہوریت وغیرہ کی کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اسلام کی حکومت کو خلافت کہیے یا جمہوریت یا کوئی اور نام دیجئے صرف وہی ہے جس میں تمام مسلمانوں کی رائے حکومت کی تشکیل میں موثر ہوا اور ایک عام آدمی حاکم یا خلیفہ وقت سے پوچھ سکے کہ تمہارے حصہ میں تو ایک چادر آتی تھی تم نے یہ لباس کہاں سے لیا جو ایک چادر سے زائد ہے۔

ظاہر ہے یہ نظام ملوکیت ' ڈکٹیٹر شپ اور اشرافیہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ڈاکٹر حمید اللہ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسلام کسی خاص طرز کے نظام کی بات نہیں کرتا صرف انصاف کا تقاضا کرتا ہے۔ انصاف اسلامی نظام کا بنیادی جوہر ہے مگر انصاف صرف وہی نظام دے سکتا ہے جو اپنے معاشرے کے افراد کو رعایا تصور نہ کرے بلکہ ہر ایک کو راعی سمجھے۔ یہ بھی عجیب طرفہ تماشا ہے کہ ہم ابھی تک اسلامی نظام کو ہی متشخص نہیں کر سکے۔ مولانا مودودی ایسی تھیا کریسی کو اسلام کہتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی ارسٹو کریسی کو اسلام کہتے ہیں' اقبال اسلامی جمہوریت کو اسلام کہتے ہیں خلیفہ عبد الحکیم اسلامی سوشلزم کو اسلام کہتا ہے ڈاکٹر حمید اللہ نے انصاف فراہم کرنے والے ہر نظام کو اسلام کہہ دیا۔ حالانکہ اسلام وہ ہے جس کے نظام حکومت میں ہر شخص راعی ہے' خدا کے اقتدار اعلیٰ کا امانت دار ہے اور وہ اجتماعی ارادے' رائے' خواہش اور کوشش سے حکومت بناتے اور چلاتے ہیں اور خدا کے ہاں اس کے لئے جواب دہ ہیں۔

اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں ان کا جواب بھسبھسا تھا۔ وحدانی' وفاقی' پارلیمانی نظام' فیڈریشن کا نظام' پراویڈنٹ فنڈ اور بالخصوص سود کے بارے میں ان کا بیان درست نہ تھا۔ سود کی حرمت کا دبے لفظوں میں انہوں نے فتویٰ عطا فرما دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے یہ تمام نظریات مسلمانوں کے سربرآوردہ طبقات' اہل مغرب' اور تجدد پسندوں کے لئے بڑے مرغوب ہیں مگر ان کے کسی خطبہ میں گہرائی اور بصیرت نہیں تھی اور ان کے جوابات بھی سطحیت کی چغلی کھاتے تھے۔ دراصل' وہ جس مقام اور مرتبے پر فائز ہیں ہم جیسے لوگ خوف زدہ ہو کر زبان نہیں کھولتے۔ ورنہ اگر کوئی ایک بار جرات کر کے کہہ دے کہ "بادشاہ ننگا ہے" تو پھر سب کو ہی زبان مل جاتی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم ڈاکٹر صاحب کے دیگر تصورات پر بھی قلم اٹھائیں گے۔ یہ صرف حرف آغاز ہے جس کی روزنامہ جنگ نے دعوت دی تھی۔○○

ہمارے تعمیر و ترقی کے منصوبے

"ٹرانس پاکستان موٹروے" کے عنوان سے جناب اقتدار احمد صاحب کا تجزیہ "ندائے خلافت" یکم جون ۱۹۹۲ء نہایت اہم اور حقیقت پر مبنی ہے۔ عام طور پر لوگ کسی بھی چھوٹے بڑے منصوبے کا یہ سوچ کر خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس سے بہر حال ملکی ترقی میں اضافہ ہی ہوگا لیکن الل ٹپ منصوبہ بندی اور ناقص کارکردگی کے نتیجے میں اس وقت ملک جس معاشی بد حالی کا شکار اور دوسروں کے رحم و کرم پر ہے اسے دیکھتے ہوئے سارا حسن ظن جاتا رہتا ہے۔۔

کارکردگی کے ضمن میں بقول شخصے پاکستان کی شہرت یہ ہے کہ ہمارے کرتا دھرتا شعور اور فہم سے عاری محض خیالی پلاؤ پکانے کے عادی ہیں جنہیں غالباً" یہ نہیں معلوم کہ دوسروں کی قوت تخلیق کی ہم یہاں فوٹو کاپی نہیں کرسکتے۔ ابتدائی دور کا ایک آدھ منصوبہ چھوڑ کر' جو کسی حد تک معیاری اور اسکینڈل سے پاک تھا مثلاً ورسک یا منگلا ڈیم وغیرہ جن کی تکمیل میں ہمارا انتظامی یا فنی حصہ نہ ہونے کے برابر تھا' شاید ہی کوئی منصوبہ ایسا ہو جو بد نظمی اور رسوائی کا باعث نہ بنا ہو۔

دنیا میں آبی گزر گاہوں کا استعمال سب سے سستا اور آسان خیال کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں سننے میں آیا تھا کہ کراچی انجینئرنگ یونیورسٹی نے دریائے سندھ کے اس مقصد کے استعمال کے لئے بڑی محنت سے ایک منصوبہ تیار کیا ہے مگر ہمارے ہاں کسی نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا' بی بی سی پر البتہ تفصیل سے اس کا تذکرہ ہوا۔

کیا میری اور آپ کی' جنہیں بہر حال اسی ملک میں رہنا ہے' یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ اس ملک کے مستقبل کی فکر کریں؟۔

محمد داؤد کھوکھر
اسلام آباد

بی بدعنوانی اور نااہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جس گاڑی پر ایم پی اے یا ایم این اے لکھا ہو فوراً ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس میں کوئی سمگلر بیٹھا ہے یا منشیات ہیں یا کوئی طوائف ہے۔ پھر یہ عوام کے نمائندے اتنے غیر محفوظ ہیں کہ ان کے آگے اور پیچھے کلاشنکوف والے باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نہ آگے کوئی محافظ تھا نہ پیچھے اور وہ بغیر کلاشنکوف والے باڈی گارڈ کے تشریف لائے ہیں۔

ہمارے ہاں قانون سازی میں عجیب افراتفری رہی ہے۔ کبھی ۱۹۶۲ء کا آئین نافذ ہوتا ہے کبھی ۱۹۷۳ء کا اور کبھی راتوں رات مارشل لاء نافذ ہوجاتا ہے۔ اگر ایک رات میں مارشل لاء نافذ ہوسکتا ہے تو ایک رات میں اللہ کا قانون نافذ کیوں نہیں ہوسکتا؟ یہاں پر جب چاہو ترمیم کرلو اور اس کو نافذ کردو۔ یہ سارے قانون انسانوں کے قانون ہیں اور حرف غیر آخر ہیں۔ اللہ کا قانون حرف آخر ہے۔ حرف آخر کو چھوڑ کر حرف غیر آخر کو کیوں نافذ کرتے ہو۔ اللہ کی کتاب لاریب ہے اور مبین ہے یعنی خود اپنے آپ کو واضح کرتی ہے۔ مجھے اللہ کی کتاب کے نہ صرف مکمل ہونے کا یقین ہے بلکہ اس کے موثر ہونے کا بھی یقین ہے۔ جو ہستی اس کتاب کو لے کر آئی ہے، تمہارے سارے دانشمند مل کر بھی اس کے برابر نہیں ہوسکتے۔

اللہ کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ اللہ نے مکمل ضابطہ حیات دیا ہے۔ اللہ کا آئین ایک ایسا آئین ہے جو لوگوں کو زبانی یاد ہے۔ کوئی اور آئین اتنے لوگوں کو زبانی یاد نہیں۔ کسی نظام نے اتنا بڑا معلم کبھی تاریخ میں پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ نظام خلافت وہ ہے جس میں اللہ کے سوا قانون ساز کوئی نہیں ہے اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کی کتاب لاریب ہے اور مکمل ہے۔ ہمارے ہاں لطیفہ یہ ہے کہ ہم "شرح" نافذ کرتے ہیں "شرع" کو نافذ نہیں کرتے۔ جب ہم کسی وقت شرع نافذ کرنے کی بات کرتے ہیں تو کسی امام یا عالم کی شرح لے آتے ہیں۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور اولی الامر کی۔ اور اگر کوئی جھگڑا ہو تو پھر اللہ اور رسول اور اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرو۔ قانون سازی میں جب لوگ عدالت میں مختلف علماء کی شرحیں لائیں گے تو پھر جج فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ قانون بن جائے گا۔ اس طرح افتراق و اختلاف ختم ہوجائے گا اور ایک ہی قانون نافذ ہوگا۔

ہمارے ہاں آج بھی حاکمیت انگریز کی ہے کیونکہ سارا قانون اسی کا نافذ کردہ ہے جو ابھی تک ہماری عدالتوں میں چل رہا ہے حالانکہ نظام خلافت کا مطلب یہ ہے کہ قانون اللہ کا ہے، اس کی کتاب لاریب ہے اور وہی کتاب مبین ہے۔ انسان کے بس میں مکمل قانون سازی ہے ہی نہیں۔ صرف اللہ مکمل قانون دیتا ہے۔ ہمارے قانون میں امر بالمعروف نہیں ہے بلکہ صرف نہی عن المنکر ہے۔ نیکی کو بھی قانون بننا چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ صرف جرم کی سزا نہ دو بلکہ نیکی کی جزا بھی دو۔ نظام خلافت میں نیکی حکماً کروائی جائے گی۔ اس قانون میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ تم میں سے سب سے بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ نیک ہے اور سب سے زیادہ نیک وہ ہے جو سب میں سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

اسلام کے سیاسی فکر میں اپوزیشن کا کوئی تصور نہیں، کوئی مخالف پارٹی نہیں بلکہ مجلس شوریٰ ہے۔ مجلس شوریٰ کا تصور ہی مختلف ہے۔ آپ مشورہ لیتے ہیں اور مشورہ صرف ماہرین سے لیا جاتا ہے جو اس میدان میں خاصا تجربہ رکھتے ہوں نہ کہ آج کل کے M.P.A.s کی طرح ہوں - اب جبکہ جمہوریت بدنام ہوچکی ہے تو اس خلا کو پر کرنا ضروری ہے۔ میرا ڈاکٹر صاحب سے مطالبہ ہے کہ وہ صرف تعلیم کی حد تک نہیں بلکہ عملی اقدامات بھی کریں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اعلاء کلمۃ اللہ ہوجائے۔ اللہ ہماری موجودہ حکومت کو ذلیل کرکے مارے گا۔ یہ ہر روز ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ جب نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان ہوا تھا تو پاکستان کو اس کی مخالفت کے لئے سب سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا۔ ہم لوگ آج وعدہ کریں کہ نظام خلافت کے لئے ہر نماز کے بعد دو نفل پڑھ کر دعا بھی کریں گے اور اس کے قیام کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک بھی ہوں گے۔

ان کے بعد جناب معین الدین شاہ صاحب نے مختصراً بیان فرمایا کہ مسلمانوں میں اسلام کے جذبہ کی کمی نہیں، ضرورت اسے بروئے کار لانے کی ہے۔

آخر میں داعی تحریک نظام خلافت، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جناب رفیق احمد باجوہ کے خطاب کے حوالے سے ان کی تائید فرمائی کہ جس طرح مارشل لاء کے نفاذ کے پیچھے فوج کی قوت موجود ہوتی ہے، اسی طرح موجودہ نظام کی جگہ نظام خلافت کے قیام کے لئے ایک طاقت ور اور منظم جماعت کا وجود ناگزیر ہے --- ایک ایسی جماعت جس کے شرکاء خود اپنی ذات کی حد تک اپنے اوپر اسلام نافذ کرچکے ہوں۔

دعا پر اس جلسہ کا اختتام رات کے پونے دس بجے ہوا۔ ○○

ماہنامہ "میثاق" کے ۱۹۶۷-۶۸ء کے اداریوں پر مشتمل
ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف
اسلام اور پاکستان
نیا ایڈیشن نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلد) -/۴۰ روپے، اشاعتِ عام -/۱۵ روپے

بقیہ : گاہے گاہے باز خواں...

ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا مشترکہ بندھن یعنی مذہب بھی اب ہمارے عوام کو صرف اسی صورت میں متحد رکھ سکتا ہی جب ہم اپنی موجودہ غیر متوازن' بے ڈول اور غیر فطری صوبائی حد بندیوں میں ردوبدل کر کے اپنے صوبوں میں اضافہ اور ان میں توازن پیدا کردیں جس سے انتظامی مرکزیت ختم ہو کر استحکام پیدا ہو جائے گا۔ ملک کے دور دراز علاقوں کی اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جانے کی بناء پر لوگ مطمئن ہو جائیں گے اور ان میں احساس محرومی بھی ختم ہوجائے گا۔

غالباً" اب بھی وقت ہے کہ ہم اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہماری قوم پر مذکورہ بالا حالات کا اتنا گہرا اثر ہو چکا ہے کہ اب کسی بھی قسم کی آئینی ضمانتیں' کتنی ہی خود مختاری' مذہبی اور اخلاقی وعظ و نصیحت یہاں تک کہ ہمارا مذہبی بندھن یا اس کے علاوہ کوئی اور اقدام علیحدگی پسند قوتوں کو ایک بار پھر سر اٹھانے سے نہیں روک سکتا۔ یہ تجزیہ بظاہر بڑا تلخ ضرور ہے مگر یہ ہمارے وجود کے اتنے ہی تلخ حقائق پر مبنی بھی ہے۔ انتشار' شورش اور نفاق کے بادل ہمارے سروں پر اس وقت تک منڈلاتے رہیں گے جب تک ہم اپنے موجودہ بے ہنگم صوبوں کی از سر نو تنظیم کر کے انہیں متناسب' چھوٹا اور ان کی تعداد میں اضافہ نہیں کر دیتے۔ یہ کیسا غضب ہے کہ ہم ایک غیر فطری نظام کی موجودگی میں ضمانتوں' خود مختاری اور مذہبی بھائی چارے کا لا حاصل شور و غوغا کرنے میں مشغول ہیں مگر اس نظام میں توازن پیدا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شر و فساد سے نجات اور ملکی استحکام اور پائیداری حاصل کرنے کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہے۔

اب اگر ہم ارد گرد نظر دوڑائیں تو بہت سی دوسری مثالوں کے علاوہ ہمارے سامنے نائیجریا کی مثال ہے' آزادی کے حصول کے بعد نائیجریا کو ہر لحاظ سے اسی قسم کے رجحانات سے واسطہ پڑا تھا جن سے پاکستان دو چار ہے۔ چونکہ نائیجریا کے تینوں صوبے آبادی اور علاقہ کے لحاظ سے بڑے بڑے تھے چنانچہ ۱۹۶۰ء میں آزادی ملتے ہی ان میں علیحدگی کے رجحانات پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے ۔ مشرقی صوبہ نے اس خاص جغرافیائی حیثیت کے باعث اپنی آزادی کا اعلان کردیا جس کے نتیجہ میں پندرہ سالہ طویل خانہ جنگی شروع ہوگئی ۔ لیکن نائیجریا کے باشعور رہنماؤں نے نہایت ہوشیاری اور دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا سیاسی حل تلاش کر لیا اور ملک کے تینوں صوبوں کو انیس صوبوں میں تقسیم کرلیا اس اقدام سے ۱۹۷۵ء میں خانہ جنگی ختم ہوگئی' جلد ہی وہاں کے عوام نے نئے صوبوں کے ساتھ اپنا اپنا تشخص قائم کر لیا اور ۱۹۸۰ء میں اقتدار عوامی نمائندوں کو بہ آسانی منتقل کردیا گیا ۔ چنانچہ اس طرح ایک پیچیدہ صورت حال اور علیحدگی کے رجحانات کے باوجود نائیجریا کے باشعور اور دانا رہنماؤں نے محض اپنے صوبوں کی تنظیم نو کے ذریعہ ایک متوازن آئینی ڈھانچہ تیار کر لیا ۔ اگر صوبوں کی از سر نو تنظیم نہ کی جاتی تو اب تک یقیناً نائیجریا بھی تین آزاد خود مختار ریاستوں میں بالکل انہی خطوط پر تقسیم ہوچکا ہوتا جن پر پاکستان ۱۹۷۱ء میں منقسم ہوگیا ۔ کاش ہمارے رہنما بھی سیاسی سوجھ بوجھ اور عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے' راقم الحروف کی بار بار پیش کردہ تجاویز کی مناسبت سے ۱۹۷۱ء سے قبل مشرقی پاکستان کو بھی کئی صوبوں میں تقسیم کردیتے تو پاکستان کبھی بھی دو لخت نہ ہوتا!(باقی آئندہ)۔

میم سین

○۔ جامعہ کراچی میں نقل کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے (شیخ الجامعہ)

○۔ شہر کے کالجوں میں امتحانات میں نقل کا کام اب ایک عمدہ کاروباری پیمانے پر جاری ہے(ایک خبر)

☆۔ جامعہ میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہوگی!۔

○۔ سماج دشمنوں پر فوج کے ذریعہ قابو پانا ہے تو پولیس پر اربوں روپے خرچ کیوں ہو؟(بلوچ لیڈر انور بھائی جان)

☆۔ کیا سماج دشمنوں کی پرورش اور ان کو تحفظ دینا کوئی کام نہ تھا؟

○۔ قوم کو اسلام کے نام پر بار بار دھوکہ دیا گیا (مولانا فضل الرحمن)

☆۔ آپ کا بالواسطہ تعلق دھوکہ دینے والوں کے ساتھ رہا ہے یا دھوکہ کھانے والوں کے ساتھ؟

○۔ ٹی وی سے لادین عناصر کو نکالا جائے (مولانا عبدالستار نیازی)

☆۔ آپ کا یہ مطالبہ اپوزیشن سے ہے یا عوام سے؟

○۔ قرضے معاف کرانے والوں کی فہرستیں شائع ہونی چاہئیں۔(شہباز شریف)

☆۔ تو پھر بسم اللہ کیجئے' لوگوں کو تو ان کا بہت انتظار ہے۔

○۔ قوم اخبارات کا محاسبہ کرے گی۔ (نواز شریف)

☆۔ اس کا طریق کار نیا ہوگا یا وہی جس کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے؟

○۔ جام صادق کی قبر پر بم کا دھماکہ (ایک خبر)

☆۔ شاید فرشتوں میں بھی تخریب کار گھس گئے ہیں۔

○۔ سندھ میں تمام دہشت گردوں کو پکڑا جائے گا۔(غلام اسحٰق خاں)

☆۔ بعد میں سیاسی دباؤ کے تحت انھیں چھوڑنا پڑے تو الگ بات ہے!

بڑھیں ' ہمارا ساتھ دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس تحریک میں شمولیت کے لئے آمادہ کریں تاکہ یہ ایک جماعت وجود میں آئے جو اس کام کو لے کر آگے بڑھے ۔

اس مجلس میں بھی تقریباً ۲۵،۲۰ حضرات نے شرکت کی ۔ یہاں پر بھی چار ورقہ اور معاونین کے فارم تقسیم کئے گئے۔ خطاب کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ جو حضرات تحریک کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ' وہ کل صبح سرکٹ ہاؤس میں تشریف لائیں ۔ انہیں گفتگو کے لئے کھلا وقت دیا جائے گا۔ آخر میں بنوں کے ایک سینئر ڈاکٹر امین الدین صاحب نے مزید گفتگو کے لئے وقت طلب کیا ۔ ایک اور ڈاکٹر نور علی شاہ صاحب نے جو ایک مخلص اور بے باک قسم کے انسان ہیں ' کھانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مزید بات چیت کے لئے اپنے گھر آنے کی دعوت دی ۔

اگلی صبح معاونین تحریک اور کئی دیگر احباب ملاقات اور گفتگو کے لئے تشریف لائے ۔ جن میں ڈاکٹر امین الدین صاحب بھی شامل تھے۔ ان سے بڑی مفید گفتگو رہی ۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دو وکیل صاحبان ثناء اللہ اور رحمت اللہ تشریف لے آئے ۔ جناب عبدالرزاق نے ان کے سامنے بھی خلافت کے خدو خال پیش کئے اور تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کے قریب جناب ڈاکٹر نور علی شاہ صاحب کے گھر پہنچے وہاں انہوں نے سات آٹھ دیگر حضرات کو بھی مدعو کر رکھا تھا جن میں ایک پروفیسر شمشیر علی صاحب سے جو اجتماع میں بھی موجود تھے ' مزید گفتگو ہوتی رہی ۔ ڈاکٹر نور علی شاہ صاحب اور پروفیسر صاحبان کو شمولیت کے لئے فارم دیئے گئے جس پر انہوں نے دلی آمادگی اور تعاون کا یقین دلایا مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ وہ دعوت سے پوری طرح متفق ہیں لیکن معاونت فارم لاہور جا کر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سامنے پر کر کے ان کو دینا چاہتے ہیں ۔

بعد ازاں مقامی ساتھیوں کے مشورے سے درج ذیل حضرات پر مشتمل کنوینگ کمیٹی تشکیل دی گئی ۔

۱) جناب سعید حمید الدین صاحب کنوینر
۲) جناب رحمت اللہ خٹک سیکرٹری
۳) جناب اختر سلیم کین ممبر
۴) انجینئر جہانگیر خان ممبر
۵) گل رؤف خٹک ممبر

بنوں سے ۲۷ر مئی کو نماز فجر کے بعد کوہاٹ کے لئے روانگی ہوئی اور تقریباً ساڑھے نو بجے جناب الطاف الرحمٰن احمد پراچہ صاحب اور موسلادار بارش نے کوہاٹ میں ہمارا استقبال کیا۔

یہاں کسی بھی طرح کا عمومی رابطہ نہیں کیا گیا تھا لہٰذا الطاف صاحب کو لے کر پہلے تنظیم کے رفیق پروفیسر نعیم سے ملنے ان کے کالج گئے ۔ وہ اپنی مصروفیت کی بنا پر فوری طور پر تو نہ آسکے مگر اپنے دوستوں کو اپنے گھر بعد از نماز عصر جمع کرنے کا وعدہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک اور پرانے رفیق سجاد احمد سے ملے اور انہیں بھی عصر کے بعد آنے کی دعوت دی ۔ علاوہ ازیں راقم کے جاننے والے پرانے کوہاٹی احباب' پروفیسر صاحب اور جناب سلطان احمد صاحب سے بھی شرکت کی درخواست کی گئی ۔ ان دونوں حضرات سے یہ بھی طے پایا کہ سلطان احمد صاحب کے گھر ان سے ساڑھے چار بجے سہ پہر ملاقات رکھی جائے۔ نعیم صاحب نے کالج سے آکر بتایا کہ وہ ذاتی مصروفیت کی بنا پر اپنے دوستوں سے رابطہ نہ کرسکے جس کی وجہ سے وہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔

ساڑھے چار بجے سلطان احمد صاحب کے گھر پر ان سے تقریباً پونا گھنٹہ تحریک خلافت کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی ۔ آخر کار خود انہوں نے اور ان کے ایک ساتھی نے تحریک خلافت میں اپنی شمولیت پر آمادگی ظاہر کی اور فارم بھی پر کیا۔ اس کے بعد تنظیم کے پرانے رفیق سجاد احمد کی دکان پر جا کر ان سے کچھ دیر گفتگو کی اور انہوں نے بھی تحریک میں شامل ہونے اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ۔ اسی شام کوہاٹ کے بازار کی ایک مسجد میں عبدالرزاق صاحب کو تحریک خلافت کے موضوع پر خطاب کا موقعہ مل گیا ' جسے پوری طرح استعمال میں لایا گیا ۔ یہاں سامعین کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔

رات عشاء کے بعد جناب الطاف صاحب سے کمیٹی کی تشکیل کے بارے میں بات چیت جاری رہی ۔ گو اس کا باقاعدہ اعلان تو نہ کیا جاسکا مگر الطاف صاحب سے اس کے بارے میں فوری طور پر کارروائی مکمل کرنے کو کہا گیا ۔ بعد نماز فجر کے ڈی اے کالونی کی خوبصورت جامع مسجد میں نظام خلافت کی برکات کے موضوع پر خطاب ہوا ۔

جمعرات ۲۸ر مئی کو صبح ۷ بجے اس دورہ کے آخری سفر یعنی پشاور کے لئے روانہ ہوگئے اور تقریباً ۱۰ بجے پشاور پہنچ گئے۔ آتے ہی رابطے کی مہم شروع کردی گئی مگر زیادہ انحصار ٹیلی فون پر کیا گیا ۔ حسب پروگرام تنظیم کے دفتر میں معاونین کا اجتماع بعد از نماز عصر منعقد ہوا ۔ تعارف اور تلاوت کے بعد وارث خان صاحب کے تمہیدی کلمات کے بعد جناب عبدالرزاق صاحب نے قرآن و سنت کے حوالے سے تحریک خلافت کے موضوع پر خطاب کیا اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب داعی تحریک خلافت کی گذشتہ دس گیارہ ماہ کی مسلسل کاوشوں اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس تحریک کے تعارف میں جان گسل دوروں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس امر کی نشان دہی کی کہ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس کام کو لے کر آگے بڑھیں اور عوام الناس کو خلافت کی برکات سے روشناس کرائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس پیغام کو پہنچایا جاسکے۔ آخر میں اپنے ڈیرہ سے پشاور تک کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے ذاتی رابطے کی افادیت کو واضح کیا اور اس کی جانب خصوصی توجہ دلائی ۔ اس اجتماع میں ۱۰ کے قریب معاونین اور ۱۵ کے لگ بھگ رفقاء تنظیم نے شرکت کی ۔

پشاور کے ساتھیوں کے مشورے سے حلقہ پشاور کی سطح پر درج ذیل حضرات پر مشتمل کنوینگ کمیٹی تشکیل دی گئی ۔

۱) جناب وارث خان صاحب کنوینر
۲) جناب عامر چودھری صاحب سیکریٹری
۳) جناب مشتاق حسین صاحب ممبر
۴) جناب اصغر علی شاہ ممبر
۵) جناب فضل حکیم صاحب ممبر

ڈاکٹر اسرار احمد
کی تالیف
استحکام پاکستان
قیمت : مجلد -/۴۰ روپے ، غیر مجلد -/۲۵ روپے
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۶۰۰۳

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

ا ہور میں دوسرا ماہانہ جلسہ خلافت

نسان نے خود اپنے لئے نظام بنایا

وگویا مریض خود ہی اپنا علاج کرنے لگا ہے

ہم "شرح" نافذ کرتے ہیں "شرع" نہیں

معہ ۵ مئی کو برکت علی اسلامیہ ہال میں ایک بارونق تقریب

رپورٹ: ریاض الحق

جلسہ کا آغاز شام پونے آٹھ بجے تلاوت زآن مجید سے ہوا۔ حافظ قاری مقبول صاحب نے ہایت خوبصورت انداز میں سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ ور ۱۱۲ کی تلاوت کی جس کے بعد ناظم تحریک ملافت عبدالرزاق صاحب نے قدرے تفصیل ے ان آیات کی تشریح بیان کی کہ بطور ایک سلمان کے ہم اپنی دینی ذمہ داریوں سے کس طرح ہدہ براء ہوسکتے ہیں۔ جس کے بعد اس جلسہ کے احد مقرر جناب رفیق احمد باجوہ صاحب کو دعوت طاب دی گئی جنہوں نے بڑی خوبصورتی سے وجودہ ملکی حالات کے حوالے سے نظام خلافت کے قیام کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

جناب رفیق احمد باجوہ نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ "غنیمت ہیں وہ لوگ جو ں اندھیرے میں بھی یہ کہتے ہیں کہ انسانیت کے لئے نظام صرف نظام خلافت ہی ہے۔ اگر دنیا اپنی بریت چاہتی ہے تو اسی نظام کو اختیار کرنا ہوگا۔ بترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو راستہ اختیار لیا ہے وہ کوئی آسان کام نہیں۔ جب بھی یہ آواز ٹھتی ہے تو اندرونی اور بیرونی آقا یہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ آواز دب جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ ر دنیا کے کسی حصے میں چاہے وہ مدینہ شہر کے ابر ہی کیوں نہ ہو' خلافت قائم ہوگئی تو دنیا کے قی حصے میں انہیں اپنا نظام قائم کرنا ناممکن ہ جائے گا"

نظام خلافت کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس نظام کا مطلب یہ ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے' انسان صرف نائب اور پیرو کار ہیں۔ اسلام اس نعرہ کے ساتھ آیا ہے کہ حاکمیت یا الہیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں' یہ صرف اللہ کا حق ہے۔ گمراہ نام نہاد دانشمندوں نے اس نظریہ کے خلاف سازش کر کے جمہوریت نافذ کردی۔ در حقیقت کرہ ارض پر کوئی حاکم نہیں تھا' پھر بندوں نے زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں پر حاکمیت قائم کی اور یہ اللہ کی حاکمیت غصب کرنے کا ایک منصوبہ تھا۔ انسانوں نے اللہ کے ساتھ جنگ شروع کی لیکن یہ جنگ انسانوں نے ہاری اور اللہ نے جیتی۔ انسان قوموں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر آپس میں لڑنے لگے حالانکہ اللہ نے فرمایا تھا کہ یہ قومیں اور گروہ تو اس لئے بنائے گئے تھے کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔

انسان نے اپنے لئے خود ہی نظام بنانا شروع کردیا تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی مریض اپنا علاج خود ہی کرنا شروع کردے۔ اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ بالکل ظاہر ہے۔ چنانچہ اس ناقص نظام کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی۔ اس کے بعد انسانوں نے لیگ آف نیشنز بنائی تاکہ جنگ کو روکا جاسکے لیکن وہ دوسری جنگ عظیم کو نہ روک سکے۔ پھر جنگ کو روکنے کے لئے یو این او بنی۔ بہت سی قوموں کے اتحاد کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے' ایک ہی قوم ہونی چاہیے تب ہی ایک حاکم کا تصور آئے گا کیونکہ انسانوں کی حاکمیت کا نظام تو غلط ہے۔

خلافت کا نظام وہ ہے جس میں خلیفہ اپنے اصل حاکم کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ اس نظام کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اللہ ہی کے حکم کے تابع ہیں۔ پھر اللہ کے حکم کے پابند لوگوں میں سے جو بہتر ہے اسے وہ اپنا خلیفہ بنائیں گے۔ کلمہ طیبہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ انسان ساری زندگی اللہ کے احکام کا تابع رہے اور اللہ کا خلیفہ بنا رہے۔ انسان جب اللہ کو الہ مان لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے احکام کا پابند بھی ہو اور الہ ہی اس کا قانون ساز ہو۔ ہر نماز میں سورۃ الفاتحہ میں انسان کیا کہتا ہے؟ یہی کہ میں تیری عبادت کا پابند ہوں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔ موذن بھی یہی کہتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔

قانون ساز دانشمند انتہائی بدقسمت ہیں جو آئینی طور پر اپنے آپ کو بیک وقت اللہ اور بندوں کی حاکمیت میں دیتے ہیں۔ یہ نظام قانونی طور پر شرک کا نظام ہے۔ اس وقت ہم آئینی طور پر شرک کے نظام میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس طرز عمل کی معافی نہیں ہوتی۔ ہم تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور ایک شریعت بل پاس کردیا جس میں شریعت کو ملکی آئین کے زیردست کردیا نہ کہ بالا دست۔

انہوں نے موجودہ عوامی نمائندوں کی بے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)